ڈاکٹر سید ظفر محمود کے شائع شدہ اردو مضامین

Published Urdu Articles of Dr Syed Zafar Mahmood

2018

تاج محل: آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

تاج محل اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے اور محبت کی نشانی کے طور پر بھی لیکن زیادہ لوگ نہیں جانتے کہ تاج محل خدا کے پیغام کی تشہیر کا عالمگیر شاہکار بھی ہے۔ اس کے چاروں طرف باہری محرابوں پر، اندرون خانہ مختلف مقامات پر اور خاص عمارت سے دور شروعاتی دروازوں پر بھی قرآن کریم کی چنندہ آیات ثلث خطاطی میں کنندہ ہیں۔ تاج محل کی لاکھوں تصاویر پوری دنیا میں دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن ان سے عموماً یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ اس مشہور ترین عمارت کی تزئین قرآنی آیات کے ذریعہ کی گئی ہے اور اس طرح تاج محل کو شاہجہاں نے اللہ کے پیغام کو عالمی سطح پر نشر کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے کہا تھا کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ جنھوں نے تاج محل دیکھا ہے اور دوسرے وہ جنھوں نے تاج محل نہیں دیکھا۔ لیکن ان کو بھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ دراصل تاج محل کی مرمریں خوبصورتی سے مرعوب ہونا ہی اس کے دیدار کا مکمل حاصل نہیں ہے بلکہ اس کی ضخیم پرکشش محرابوں پر تحریر شدہ آفاقی پیغام کو سمجھ کر دل میں اتار لینے سے ہی اس کے دیدار کا حق ادا ہوتا ہے۔ کیا خوب کہا علامہ اقبال نے:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

مشہور عالم دین مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب 'نقوش اقبال' میں لکھا ہے کہ تاج کو چاندنی میں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مرمر کی سلوں میں آب رواں سے زیادہ تیزی آ گئی ہے، ابد کا طویل دور یہاں کے ایک ایک لمحہ کے برابر ہو گیا ہے، یہاں عشق نے پتھروں کی زبانی اپنا راز کھولا اور انھیں نوک مژگاں میں پرویا ہے، یہاں سنگ و خشت سے جنت کے نغمے پھوٹ رہے ہیں اور عشق حدود و تعینات کی سرحدیں پھاند کر لازوال ہو گیا ہے، عشق سے اہل دل کو سینہ بسینہ اور اہل ہنر کو ید بیضا مل جاتا ہے۔ تاج محل پر یہ خطاطی ایران کے عبدالحق نے کی تھی جو 1609 میں شیراز سے ہندوستان آئے تھے، ان کی درخشاں فن شناسی کے انعام کے طور پر بادشاہ نے انھیں امانت خاں کے خطاب سے نوازا تھا۔ قرآن کریم کا پیغام کہ یہ دنیا مختصر وقفہ کے لیے ہے اور عقلمندی اس میں ہے کہ انسان یہاں مالک حقیقی کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کے اس کی دیگر مخلوق کی زندگی آسان بنانے میں تعاون دیتا رہے، شاہجہاں کو اپنی ملکہ کے قبل از وقت انتقال کے بعد زیادہ سمجھ میں آیا۔ لہٰذا ان کی یاد میں تعمیر شدہ مقبرہ کو دنیا کی خوبصورت ترین عمارت بنانے کے ساتھ شاہجہاں نے اسے مستقبل میں زائرین کے لشکروں اور انٹرنیٹ سرفنگ کرنے والے کروڑوں لوگوں تک خدا کا آخری پیغام پہنچانے کا نشان تبلیغ بھی بنا دیا، جس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے سے انسان اپنی روح کو جسم کی سطح سے اونچا رکھنے میں کامیاب رہ سکتا ہے۔ جس دروازہ سے تاج محل میں عموماً داخلہ ہوتا ہے اس پر سورۂ یٰسین آیات 45-66 کنندہ ہیں، جن میں اللہ کی نشانیوں اور اپنے فہم و ذکاء کی بنیاد پر اس کی وحدانیت کو سمجھنے، تصور آخرت اور حضور اقدسؐ کو رسول آخر الزماں تسلیم کرنے سے متعلق تذکرہ ہے۔

❝اگر ملت کے افراد یہ طے کر لیں کہ جب بھی وہ تاج محل جائیں گے تو وہاں کی تصاویر لینے میں اس کا لحاظ رکھیں کہ قرآنی خطاطی نمایاں طور پر تصاویر کا حصہ بنے بلکہ کچھ زیادہ سمجھدار لوگ تصویر میں دکھائی گئی آیت کا آسان زبان میں معیاری مثبت مفہوم بھی بہت مختصر الفاظ میں تصویر کے ساتھ تحریر کر دیں تو کچھ دنوں میں دنیا میں یہی رواج بن جائے گا اور اس کے ذریعہ ملی فوائد کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔❞

آگے بڑھئے تو سورۂ اخلاص پڑھنے کو ملتی ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ اللہ یکتا ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، یہی سورۂ خلافت امویہ کے دوران ساتویں صدی عیسوی میں عبدالملک ابن مروان نے بیت المقدس پر لکھوائی تھی۔ پھر سورۃ التکویر نظر آتی ہے، جس میں مؤنث طفل کشی (Female infanticide) پر ضرب لگائی گئی اور آگے آنے والی پوچھ تاچھ اور سزا سے ڈرایا گیا۔ سورۂ روم کو اسلام کے خانگی نظام زندگی کی سنگ بنیاد بنایا گیا، کہا گیا کہ ترکیب حیات میں بیوی شوہر کی ہم جنس مخلوق ہے، ویسی ہی جذبات و احساسات رکھنے والی، دونوں ایک دوسرے کے لیے سرمایہ راحت و تسکین اور باعث سکون خاطر۔ اسی طرح دیگر متعدد قرآنی آیات تاج محل کی عمارت پر جلی حروف میں کنندہ ہیں، سورۂ یوسف میں اللہ نے فرمایا کہ ہر صاحب علم سے بڑھ کر ایک عالم موجود ہے (12.76)، پس کوئی بھی اپنے علم پر نازاں نہ ہو۔ اسی سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کا بہ طرز قبولیت حوالہ دیا (12.59) کہ 'میں مہمان نوازی خوب تر کرتا ہوں' یعنی مہمان نوازی کو مہذب سماج کی پہچان بنا دیا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں انسان کے وقت، ذرائع، اثاثہ، آمدنی اور جذبہ محبت میں سے رشتہ داروں کا برتر حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا، یاد رکھئے کہ یہاں لفظ 'حق' ہی استعمال کیا گیا ہے نہ کہ حصہ، اس کے بعد مساکین اور ابن السبیل کا ذکر آیا ہے اور آیت کے اختتام پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنے مال کو فضولیات میں نہ اڑایا کرو، نہ گناہ والے کاموں میں اور نہ ہی خرچ برائے مقصود شہرت و تفاخر میں۔ اسی سورۃ میں آگے (17.34) کہا گیا کہ عہد کی پابندی رکھو بیشک عہد کی باز پرس ہو گی، اس میں ہر قسم کے جائز وعدے اور معاہدے آ گئے بلکہ تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ سورۂ احزاب میں مزید وضاحت کی گئی کہ (33.6) باقی سماج کے مقابلہ میں رشتہ دار آپس میں ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں، سلہ رحمی کو ضرورتمند رشتہ داروں کا حق بتایا گیا، ان میں بھی یتیم رشتہ دار کو ترجیح دی گئی (90.15)، سورۂ شوریٰ میں رشتہ داروں کے گروپ کو مودۃ فی القربیٰ (42.23) کہا گیا۔ سورۂ بقرہ میں (2.48) فیصلہ کے دن سے ڈرایا گیا ہے، جس دن کوئی سفارش قبول نہیں ہوگی۔

سورۂ بقرہ میں ہی اسکیم الٰہی بیان ہوئی (2.38) جس کے تحت دنیا میں کثیر تعداد میں رسول و پیغمبر تعینات کیے گئے اور ان میں سے کئی کو کتابیں بھی دی گئیں۔ سورۂ بقرہ، سورۂ نمل اور سورۂ قصص میں حکم دیا گیا کہ اللہ سے ضرور ڈرا جائے اور باقی کسی سے بھی نہیں ڈرا جائے (16.51,27.10,28.31) کیونکہ اللہ ہی ہر طرح کے انعام و عطاب پر قادر ہے۔ سورۂ فرقان میں واضح کیا گیا کہ (25.45) اللہ نے آفتاب کے طلوع و بلندی کی ایک ظاہری علامت سایہ کی درازی و کوتاہی کو بنا دیا۔ اہل اشارات نے یہاں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ سارے عالم کی تخلیق، ربوبیت اور فنا حق تعالیٰ کے آفتاب قدرت سے وہی نسبت رکھتی ہے جو سایہ کو نور آفتاب سے ہے۔ آگے سورۂ مومن میں ذکر ہے کہ جتنے پیغمبروں کے نام قرآن کریم میں درج ہیں، ان کے علاوہ بھی پیغمبروں کی ایک تعداد ہے جو اس کتاب میں بیان نہیں کی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں کہا گیا (4.163-164) کہ حضورؐ کے علاوہ متعدد دیگر پیغمبروں پر بھی وحی اتری تھی، ایسے کئی رسولوں کے نام قرآن کریم میں درج ہیں اور بہتوں کے نام نہیں دیے گئے ہیں، سورۂ ابراہیم میں ظاہر کر دیا گیا کہ ہر رسول کو اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا اسی کی زبان میں۔ اس طرح دنیا کو پیغمبروں، رسولوں اور آسمانی کتابوں کے تانے بانے کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا ہے اور آخری امت کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ سبھی رسولوں، پیغمبروں اور کتابوں کی قدر و احترام کرے (2.285) اور اگر کوئی ان کتابوں، رسولوں اور پیغمبروں کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو وہ کفر کے درجہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

اب ذرا غور فرمائیں کہ یہ سب اور سیکڑوں دیگر قرآنی حکایتیں تاج محل کی محرابوں اور دیگر مقامات پر تحریر کی ہوئی ہیں اور مع اس خطاطی کے تاج محل کی تصاویر دنیا بھر میں پسند کی جاتی ہیں، پورے عالم میں ان کی پذیرائی ہوتی ہے، تو اگر ملت کے افراد یہ طے کر لیں کہ جب بھی وہ تاج محل جائیں گے تو وہاں کی تصاویر لینے میں اس کا لحاظ رکھیں کہ قرآنی خطاطی نمایاں طور پر تصاویر کا حصہ بنے بلکہ کچھ زیادہ سمجھدار لوگ تصویر میں دکھائی گئی آیت کا آسان زبان میں معیاری مثبت مفہوم بھی بہت مختصر الفاظ میں تصویر کے ساتھ تحریر کر دیں تو کچھ دنوں میں دنیا میں یہی رواج بن جائے گا اور اس کے ذریعہ ملی فوائد کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 11 Jan-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

ہماری جمہوریت اور اس کے تقاضے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”ایک طویل عرصہ سے دنیا بھر میں ہندوستان کی پہچان ایک جمہوری مشعل کی رہی ہے، مساوات اور شمولیت ہماری تاریخی تہذیب رہی ہے، لیکن حالات حاضرہ کے تئیں ہر مہذب ہندوستانی کے لیے بے چینی لازمی ہے۔15 ستمبر کی یاد سے ہم تو غافل ہو گئے، ہاں اقوام متحدہ کے کمشنر برائے حقوق انسانی نے ہمارے ملک میں موجودہ دوہرے پیمانوں پر اظہار تشویش ضرور کیا۔“

اقوام متحدہ کے ذریعہ عالمی یوم جمہوریت 15 ستمبر کو منایا جانا چاہیے تھا اور 2017 میں اس کا مخصوص موضوع تھا سماجی شمولیت اور تنازع نہ ہونے دینے کے لیے احتیاطی تدابیر (Inclusion and conflict prevention)۔ایک طویل عرصہ سے دنیا بھر میں ہندوستان کی پہچان ایک جمہوری مشعل کی رہی ہے، مساوات اور شمولیت ہماری تاریخی تہذیب رہی ہے، لیکن حالات حاضرہ کے تئیں ہر مہذب ہندوستانی کے لیے بے چینی لازمی ہے۔ 15 ستمبر کی یاد سے ہم تو غافل ہو گئے، ہاں اقوام متحدہ کے کمشنر برائے حقوق انسانی نے ہمارے ملک میں موجودہ دوہرے پیمانوں پر اظہار تشویش ضرور کیا۔ ہمیں یاد ہے کہ ماضی قریب میں ہم نے خود کی تنگی کے باوجود فراخ دلی سے کام لے کر لاکھوں تمل و بنگلہ دیشی لوگوں کی مکمل میزبانی کی اور تبت و نیپال کے غیر ملکیوں کو تو ہم اپنا ہی مان چکے ہیں، جس کی وجہ سے ہمیں عالمی شہرت و نیک نامی ملی، لیکن اکیسویں صدی کے موجودہ دور میں ہمارے پیمانے میں پاسنگ آ گیا، ہماری آنکھ بھینگی ہو گئی، اچانک ہمیں چند ہزار مصیبت کے مارے روہنگیا برے لگنے لگے، حالانکہ اس معاملہ میں ایجنڈا بے نقاب ہو گیا، جب شور مچانے کے باوجود ان کے خلاف زمینی سطح پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی کیونکہ سیاسی فائدہ تو پہنچ ہی چکا تھا اور عالمی رائے عامہ کا احترام بھی کرنا تھا۔ انہی وجوہات کے سبب اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے حقوق انسانی نے ملک میں اقلیتوں کے خلاف بڑھتے ہوئے غیر روادارانہ رویہ پر افسردگی جتائی۔ انھوں نے صحافی گوری لنکیش کے قتل کے بارے میں انتباہ کیا کہ ملک میں جو لوگ بنیادی انسانی حقوق کی وکالت کرتے ہیں اور جو سماج کو اندر سے گلا دینے والی نفرت و فرقہ پرستی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، ان کے جان و مال کے خطرہ پر تشویش کا اظہار کیا۔

مئی 2017 میں جنیوا میں منعقد اقوام متحدہ کے کمیشن برائے رفیوجیز کے ستائیسویں عالمی میعادی جائزہ والی رپورٹ (HNHCR: Universal Periodic Review: UPR) پیش ہونے والی میٹنگ میں ہمارے نمائندے اٹارنی جنرل مکل روہتگی نے کہا تھا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، جہاں حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور ہر شہری کو مکمل مذہبی آزادی ہے، مذہب کی بنیاد پر کوئی تعصب نہیں ہوتا ہے۔ ہر ایک کو بولنے کی اور دیگر طریقہ سے اظہار خیال کرنے کی آزادی ہے، ہمیں انفرادی وقار کی پاسداری کا پورا خیال ہے، ہمارے یہاں اذیت پہنچانا اجنبی تصور سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس پر عالمی حقوق انسانی تنظیم کی صلاح کار محترمہ ماجا داروو الا نے ٹوئٹ کیا کہ ”مکل روہتگی کو ہندوستان کے متعلق یو پی آر کی رپورٹ پڑھنی چاہیے، میں چاہتی ہوں کہ اس ملک میں جاؤں تو زندہ رہوں“۔ اس رپورٹ کو سننے کے بعد کاؤنسل کے 42 اراکین نے کہا کہ ہندوستان کو قومی انسانی حقوق پلان بنانا چاہیے، اذیت کے خلاف کنونشن کی توثیق کر دینی چاہیے، حفاظتی فورسز کے ذریعہ زیادتیوں کو بند کیا جانا چاہیے، مسلح دستوں کے مخصوص اختیارات قانون (Armed Forces Special Powers Act) کو منسوخ کیا جائے، عدلیہ کی آزادی کو مضبوط کیا جائے اور فیصلوں میں دیر نہ لگے اس کے لیے معقول بندوبست کیا جائے، سزائے موت ختم کی جائے، گروپوں اور افراد کے خلاف تعصب ختم کیا جائے، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں خواتین کی حصہ داری بڑھانے کے لیے قانون بنایا جائے اور فارن کنٹریبیوشن ریگولیشن قانون میں ترمیم کی جائے، تاکہ حقوق انسانی کے عالمی محافظ ملک میں کام کر سکیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہیں کہ آزادی کے 70 برس کے بعد ہندوستانی جمہوریت میں کچھ پیوند کاری کی ضرورت ہے۔ ماجا داروو الا آگے لکھتی ہیں کہ ہمارے یہاں ایک قانونی ڈھانچہ اس ساخت کا تیار ہو رہا ہے کہ زور زبردستی کرنے میں زیادہ دقت نہیں رہ گئی ہے، اعلیٰ سطحی روک ٹوک کی کمی ہوتی جا رہی ہے، اس لیے سرکاری ایجنسیاں عموماً اپنے حقوق سے تجاوز کرتی ہیں، بے عذابی اور سزا سے چھٹکارے کی وجہ سے سیکورٹی فورسز کے لیے جبر کرنا آسان ہے۔ عدالت عظمیٰ کو عدل کا آخری پائیدان ہونا چاہیے لیکن اکثر وہ انصاف کی پہلی سیڑھی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ شہری آزادی کے بچاؤ میں ہائی کورٹ کے دائرۂ اختیار میں نرمی اور زوال پذیری نظر آتی ہے، قومی تحفظ کی تعریف اکثر مصنوعی تشریح کا شکار رہتی ہے، قومی مفاد کی تعریف سیاسی ایجنڈے سے طے ہوتی ہے، یہی حال امن و امان کے تصور کا بھی ہے۔ اس چکرویوہ میں حکومتوں کے لیے جمہوریت قائم رکھنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اور وہ مفلوج ہوتی جا رہی ہیں۔ پنچایتوں کو ہی دیکھ لیجیے، ساز و سامان کی قلت، مالی تنگی، سیاسی تناؤ کا ماحول، ذیلی عدالتوں میں بھی مالی تنگی، اسٹاف کی کمی، انفارمیشن کمیشنوں میں بھی انتظار کی لمبی قطاریں، پولیس میں پرانا استعماریت سے اثر انداز تنظیمی ڈھانچہ۔ لوگ اپنی آزادی اور جمہوری حقوق سے لطف اندوز ہوں تو کیسے ہوں؟ اس کے بجائے تشدد کے خطرات کی تلوار کے سائے میں زندگی کو بچا کر برقرار رکھا جائے وہی بہت ہے، اس میں غریب امیر، عورت مرد، سیاسی کارکن یا میڈیا کارندہ سب ایک جیسے ہیں اور کسی کو مفر نہیں ہے۔ لہٰذا اس تخت و تاراج کے ماحول میں حقوق کی کتنی گنجائش ہے؟ اور جب حقوق پامال ہو رہے ہوں تو جمہوریت کیسے پھلے پھولے گی؟ اس کا حل آمریت اور استبدادیت میں اضافہ نہیں ہے نہ آزادی پر مزید قید و بند۔ آخر میں محترمہ داروو الا لکھتی ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ظلم و تشدد کے چیتے ہر طرف پھر رہے ہیں لیکن حل یہ ہے کہ چیتے سے چھٹکارا پا لیا جائے نہ کہ شکار کو پنجروں میں بند کر دینا۔

اس ضمن میں دراصل ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قرآن کریم میں بھی ہمیں ”لاتخف“ کی ہدایت دی گئی ہے (28.31) یعنی خوف مت کرو اور آگے بڑھو، تم امن والے ہو۔ عبداللہ یوسف علی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس حکم کے ذریعہ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اعلیٰ روحانی مقصد کی تلقین کی تھی، انھیں مصریوں کی نفرت کا سامنا کرنا تھا اور ان کے فریب و دغا کے باوجود اپنے لیے راستہ نکال لینا تھا، اس کے لیے انھیں ایمان کا تحفظ دیا گیا تھا، تمام خطرات و مشکلات میں اللہ ان کی رہنمائی کرنے والا تھا کیونکہ اب وہ خدمات ایزدی پر تعینات تھے۔ علاوہ ازیں بیضوی سفید چمکدار بنانے کے لیے اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کا انتخاب کیا اور اسے روحانیت بخش دی اور اس طرح رہتی دنیا تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم کو جوڑ کر اپنے ہی بازو کے دم پر ہمیں ملی بقا کے لیے متحرک رہنا ہے۔ اس کے آگے حکم الٰہی یہ بھی ہوا کہ اپنے ہاتھوں کو سمیٹ لو، یہاں ہاتھ کے لیے جناح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں چڑیا کے پر جنھیں وہ سمیٹ کر اپنے تئیں خود اعتمادی کا احساس کرتی ہے، اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگے بڑھ کے ملی فلاح کے لیے تگ و دو کرنے کے دوران کفالت خداوندی کا احساس کروایا گیا۔ تفسیر ابن کثیر میں تحریر ہے کہ خوف کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نکال کر اللہ نے فرعون کے دل میں ڈال دیا تھا۔ اسی قرآنی ایما پر علامہ اقبال نے بھی ہمیں توجہ دلائی ہے:

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 18 Jan-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

عالمی عدم مساوات رپورٹ 2018

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

عالمی عدم مساوات رپورٹ 2018 (World Inequality Report-WIR) کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے 100 سے زائد قابل ترین تحقیق کاروں کی باہمی تحقیق وتعاون پر مبنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر تھامس پکیٹی جو پیرس انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس کے چیئر مین اور لندن اسکول آف اکنامکس میں ایسوسی ایٹ چیئر مین ہیں، انھوں نے اس رپورٹ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مل کے تیار کیا ہے۔ ان کی 2013 کی کتاب 'اکیسویں صدی میں سرمایہ کاری' (Capital in the 21st Century) پوری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے، جس میں انھوں نے گزشتہ 250 برس میں دنیا میں دولت کے چند ہاتھوں میں منجمد رہنے اور اس کے سماج میں گردش نہ کرنے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اب تک اس کتاب کا دنیا کی 37 زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دراصل انھوں نے 2000 میں 'عالمی دولت و آمدنی کے اعداد و شمار' (World Wealth & Income Data Base) پروجیکٹ کی شروعات کی تھی یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان کے ذریعہ دی گئی اطلاعات کی بنیاد پر پڑھی لکھی دنیا کے لوگ عدم مساوات کی طویل مدتی حرکیات (Long term dynamics of inequality) سے متعلق اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تازہ رپورٹ میں صحت، تعلیم، اچھی تنخواہ والے روزگار اور ماحولیاتی تحفظ کے لیے سرکاری سرمایہ کاری کی وکالت کی ہے۔ تعلیم ازخود عدم مساوات کو دور نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ اچھی تنخواہ والا روزگار، مزدوری کی مناسب شرح اور کمپنی کے بورڈ میں مزدوروں کی نمائندگی کو یقینی نہ بنایا جائے۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم مساوات یوروپ میں سب سے کم ہے، مغربی ایشیا میں سب سے زیادہ اور براعظم افریقہ کے جنوبی حصہ، برازیل اور ہندوستان میں کافی زیادہ ہے۔ ملکی دولت میں امیر ترین 10 فیصد لوگوں کی حصہ داری یوروپ میں 37 فیصد، مغربی ایشیا میں 61 فیصد اور براعظم افریقہ کے جنوبی حصہ، برازیل اور ہندوستان میں 55 فیصد ہے۔

جب تک دوسری جنگ عظیم کے اثرات قائم رہے تو دنیا میں اقتصادی پالیسی انسانی مساوات عقیدہ (Egalitarianism) کے تحت بنتی رہی، جس میں سماجی تحفظ، تعلیم عامہ، مزدوری کی شرح اور بتدریج بڑھنے والا ٹیکس (Progressive Taxation) سسٹم شامل تھے، اس کی وجہ سے ایک موروثی متوسط طبقہ (Patrimonial middle class) قائم ہو گیا۔ ضمنی طور پر یہاں یہ نوٹ کر لینا ضروری ہے کہ شدید عدم مساوات کی وجہ سے اگر کہیں سماجی تنازع بڑھ جاتا ہے تو یہی طبقہ حالات میں ٹھہراؤ قائم کر سکے گا۔ 1980 کے آس پاس دنیا میں عدم مساوات کے رجحان میں تبدیلی آ گئی، جب امریکہ، برطانیہ، ہندوستان اور چین میں فری مارکیٹ اقتصادی پالیسی کی شروعات ہوئی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں سابق سوویت یونین میں ذاتی جاگیرداری ختم کر دی گئی، زمین کو زیادہ لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، تعلیم عامہ میں بڑے پیمانہ پر سرمایہ کاری کی گئی اور پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ اقتصادی نظام پر سخت کنٹرول رکھا گیا۔ اس بنا پر گزشتہ صدی کی تیسری سے آٹھویں دہائی تک ترقی کے فائدے عوام کو ملتے رہے۔ اسی طرز پر تشکیل شدہ اشتراکی پالیسی کی وجہ سے اسی دور میں ہندوستان میں بھی عدم مساوات میں کمی آئی اور آٹھویں دہائی میں ملکی اقتصادی ترقی کا تھوڑا ہی حصہ اقتصادی اشراف کے پاس رہ گیا تھا۔ ہندوستان میں ان کی حصہ داری اس دوران 20 فیصد سے گھٹ کے 6 فیصد رہ گئی تھی، لیکن گزشتہ چار دہائیوں میں قومی ترقی میں ان کی حصہ داری دوبارہ بڑھ کے 22 فیصد ہو گئی ہے، اس رجحان کی شرح امریکہ میں سب سے زیادہ ہے، جس کی وجہ ہے وہاں تعلیم کے میدان میں بھاری عدم مساوات اور بتدریج نہ بڑھنے والا ٹیکس سسٹم ہے۔ نتیجتاً مختلف ممالک میں قومی دولت پر مالکانہ حق سرکار سے ہٹ کر پرائیویٹ ہاتھوں میں چلا گیا ہے، جس کی وجہ سے ملک تو دولت مند ہو گیا، لیکن حکومت مالی تنگی کی طرف بڑھنے لگی اور حکومت کے لیے ملک کے اقتصادی نظام میں پابندیاں لگانا، آمدنی کو نئے سرے سے تقسیم کرنا اور عدم مساوات میں تخفیف لانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر دنیا کے ممالک یوروپ کی پالیسی اختیار کریں گے تو عدم مساوات میں کمی آ سکتی ہے لیکن امریکی ماڈل پر چلنے سے تو اس میں اضافہ ہی ہونا ہے۔ اگر ہمیں اقتصادی ترقی چاہیے تو ٹیکس ریٹ بتدریج بڑھنے والے ہی بنانے ہوں گے، اس سے بہت زیادہ آمدنی والوں کی ملکی ترقی کے بڑے حصہ پر ذاتی قبضہ کر لینے کے لیے حوصلہ شکنی (Disincentive) ہونے لگے گی۔ ورثہ ٹیکس جسے ہندوستان میں اسٹیٹ ڈیوٹی کہا جاتا تھا، اسے 1986 میں ختم کر دیا گیا تھا، اسے واپس لایا جانا چاہیے۔ رپورٹ میں دنیا کی ٹیکس بچانے والی جنتوں (Tax heavens) کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے متعدد طریقوں کے ذریعہ ٹیکس سے بچ نکلنے کے حیلے بہانے دستیاب ہو جاتے ہیں، ان کا ذکر پناما پیپرس اور پیراڈائیز پیپرس میں ہوا ہے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی سے اب تک اس منجمد دولت میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے اور اب قومی پیداوار کا 10 فیصد حصہ وہاں کے بینک کھاتوں میں جمع ہے۔ آزاد ہندوستان میں پہلی مرتبہ 1991-2000 کے دوران اقتصادی اصلاحات چلائی گئیں، جن کے ذریعہ پرائیویٹ سیکٹر کو اقتصادی پالیسی میں مرکزیت دی گئی، لیکن اس کی وجہ سے ہماری قومی آمدنی میں امیر ترین اشخاص کا حصہ 56 فیصد ہو گیا۔ اب ہمارے ملک میں امیر ترین لوگوں کی تعداد تقریباً 8 لاکھ ہے، جبکہ 40 کروڑ لوگوں کا شمار ملکی اقتصادی گراف کے نچلے والے آدھے حصہ میں ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی کی تکنیکی ترقی اور عالمگیریت (Globalisation) کی بنا پر کچھ لوگ بہت آسانی سے قومی ترقی کے بڑے حصہ کو ذاتی ملکیت میں کر لیتے ہیں، اس کو سپر اسٹار افیکٹ (Superstar Effect) کہتے ہیں۔ اس طرح انفرادی ذہانت کے تھوڑے فرق کو بھی امتیازی آمدنی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا علاج صرف روحانیت میں ہی ممکن ہے یعنی پروردگار کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر انسان خود اپنے اوپر کنٹرول کرے، آمدنی تو اپنی خداداد استطاعت کے اعتبار سے کرے، لیکن اس میں سے خرچ صرف اپنی جائز ضرورت کے مطابق کرے اور باقی کو دیگر ضرورت مندوں کا مانے۔

بتدریج بڑھتے ہوئے ٹیکس ریٹ کی وجہ سے سرکار کی جو اضافی آمدنی ہو، اسے سماج میں باہمی منصفانہ ترقی کی اسکیموں پر خرچ کرنا چاہیے۔ بین الاقوامی مزدور تنظیم (International Labour Organization- ILO) کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مجموعی آمدنی میں مزدوروں کا حصہ متواتر گھٹتا ہی جا رہا ہے اور کسی بھی کاروباری اکائی میں کام کرنے والے لوگوں میں سے 80 فیصد سے زیادہ لوگوں کو وہاں دی جانے والی اوسط تنخواہ سے کم تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے قلیل ترین اجرت کا ضابطہ بنا کر اس کا نفاذ کرنا روشن خیال سرمایہ کاروں اور حکومت کی اہم ذمہ داری ہے۔ فراہمی مواقع کے میدان میں بھی عدم مساوات پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ امریکہ میں بھی سب سے کم آمدنی والے 10 فیصد والدین کے ہر 100 بچوں میں سے 20-30 ہی کالج جا پاتے ہیں جبکہ امیر ترین 10 فیصد والدین کے ہر 100 بچوں میں سے 90 کالج ضرور جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو یہ خلیج وسیع تر ہے۔ ظاہر ہے یہ سب خرابیاں خلا میں تو پیدا ہوئی نہیں ہیں، یقیناً یہ نتیجہ ہیں غلط ملکی پالیسیوں میں ضروری ردوبدل کرنا حکومت کا کام ہے، جسے آئین ہند کے رہنما اصول نمبر (b&c)39 پر توجہ دینی ہوگی، جہاں اس کی ذمہ داری بنائی گئی ہے کہ ملکی پالیسی ایسی ہو، جس سے مادی وسائل کی ملکیت اور ان پر کنٹرول کو اس طور پر عوام میں تقسیم کیا جائے جو مفاد عامہ میں معاون ہو اور اقتصادی سسٹم ایسا ہو کہ جس سے ملکی دولت اور پیداوار کے ذرائع چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔

□❖□

> ”غلط ملکی پالیسیوں میں ضروری ردوبدل کرنا حکومت کا کام ہے، جسے آئین ہند کے رہنما اصول نمبر (b&c)39 پر توجہ دینی ہوگی، جہاں اس کی ذمہ داری بنائی گئی ہے کہ ملکی پالیسی ایسی ہو، جس سے مادی وسائل کی ملکیت اور ان پر کنٹرول کو اس طور پر عوام میں تقسیم کیا جائے جو مفاد عامہ میں معاون ہو اور اقتصادی سسٹم ایسا ہو کہ جس سے ملکی دولت اور پیداوار کے ذرائع چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔“

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 25 Jan-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

یروشلم پر صدر ٹرمپ بنام عالمی خوش ترتیبی

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

یروشلم کو اسرائیل کا دارالسلطنت تسلیم کرنے کے صدر ٹرمپ کے فیصلے کے خلاف ترکی اور یمن کے ذریعہ اقوام متحدہ جنرل اسمبلی میں پیش کردہ قرارداد کے حق میں زبردست عالمی ووٹنگ سے اس موقف پر بین الاقوامی برادری کا طیش ظاہر ہوگیا۔ قرارداد میں یروشلم کے اصلی رتبہ کے بارے میں سیکورٹی کونسل کے متعدد فیصلوں کا حوالہ دیتے ہوئے ممبر ممالک سے زور دے کر کہا گیا کہ وہ اپنے سفارت خانے یروشلم میں قائم نہ کریں کیونکہ وہ شہر تینوں ابراہیمی مذاہب کے لیے مقدس ہے۔ اپنے کرسمس کے پیغام میں پوپ فرانسس نے فلسطین اور اسرائیل کے مابین گفت وشنید کی بنیاد پر تصفیہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے تنازع کے دو ریاستی حل کے لیے دعا کی۔ انھوں نے کہا کہ مشرق وسطیٰ کی بڑھتی ہوئی کشیدگی میں وہاں کے ہر بچے کے چہرے میں انھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا کرب دکھتا ہے۔ جنرل اسمبلی میں ترکی ویمن کی قرارداد کے حق میں 128 اور مخالفت میں 9 ووٹ پڑے، 35 نے ووٹ نہیں ڈالا اور 21 غیر حاضر رہے۔ کناڈا اور میکسیکو نے مجبوراً اس وجہ سے ووٹ نہیں دیا کیونکہ یہ دونوں ممالک فی الوقت شمالی امریکی آزاد تجارت معاہدہ (NAFTA) پر امریکہ کے ساتھ محو گفتگو ہیں اور صدر ٹرمپ اس گروپ کو چھوڑنے کی دھمکی دے چکے ہیں، اگر امریکہ الگ ہو جاتا ہے تو ان دو ممالک کی اقتصادیات پر منفی اثر پڑے گا۔

ووٹنگ سے قبل اقوام متحدہ میں خاتون امریکی نمائندہ نکی ہیلی نے کثیر تعداد میں حکومتوں کو لکھا تھا کہ صدر امریکہ اس ووٹ میں ذاتی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ووٹنگ سے پہلے اپنی تقریر میں انھوں نے یاد دلایا کہ اقوام متحدہ کے لیے امریکہ سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے اور وہ امید کرتا ہے کہ اس خیرسگالی کا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے باوجود اس قرارداد پر جن چند ممالک نے امریکہ کے حق میں ووٹ دیا بھی تو وہ وہی ہیں جہاں امریکہ کی حمایت سے تحکم پسند حکومتیں چل رہی ہیں یا وہ بہت چھوٹے جزیرے ہیں جیسے جزیرہ مارشل، ناؤرو، مائکرونیشیا، پلوا۔ ہنڈوراس نے امریکہ کی حمایت کی کیونکہ وہاں دغابازی پر مبنی الیکشن کے نتیجہ کو امریکہ نے تسلیم کرلیا تھا جبکہ اس خطہ یعنی لاطینی امریکہ کے زیادہ تر ممالک نے اس الیکشن کے غیر معتبر ہونے کا اعلان کردیا تھا۔ ہنڈوراس اور گوتیمالا کی سیکورٹی ایجنسیوں کو اسرائیل ہتھیار فروخت کرتا ہے اور لاطینی امریکہ کے صرف انھی دو ممالک نے قرارداد میں امریکہ کے حق میں ووٹ دیا۔ ادھر ہندوستان کی موجودہ حکومت اب اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے رفیوجیز کی ایسی قراردادوں میں ووٹنگ سے پرہیز کرنے لگی ہے جن میں اسرائیل کی مذمت کی جائے۔ دہلی میں عرب ممالک کے سفیروں نے وزارت خارجہ کو خط لکھ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا کہ یروشلم سے متعلق امریکی فیصلہ کی حکومت ہند نے تنقید نہیں کی۔ بعد میں اقوام متحدہ کی ووٹنگ میں ہندوستان نے فلسطین کے حق میں ووٹ دیا، دراصل ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی ہندوستان کے لیے آسان نہیں تھا کیونکہ امریکہ کے قریب ترین اتحادیوں برطانیہ اور فرانس نے بھی قرارداد پر فلسطین کے حق میں ووٹ دیا، اب ان پر بھی سبقت لے جانے کے لیے وزیراعظم مودی فروری میں فلسطین کے دورہ پر جارہے ہیں۔

”اقوام متحدہ کی ووٹنگ میں ہندوستان نے فلسطین کے حق میں ووٹ دیا، دراصل ووٹ دینے سے گریز کرنا بھی ہندوستان کے لیے آسان نہیں تھا کیونکہ امریکہ کے قریب ترین اتحادیوں برطانیہ اور فرانس نے بھی قرارداد پر فلسطین کے حق میں ووٹ دیا، اب ان پر بھی سبقت لے جانے کے لیے وزیراعظم مودی فروری میں فلسطین کے دورہ پر جارہے ہیں۔“

یاد کیجیے کہ 1975 میں اقوام متحدہ نے صہیونیت (Zionism) کونسل پرستی (Racism) جیسا بتایا تھا، تب بھی امریکہ نے اقوام متحدہ کو اپنی مالی مدد روک دینے کی دھمکی دی تھی۔ اس کے 16 برس بعد امریکی دباؤ میں اقوام متحدہ نے اس قرارداد کو منسوخ کر دیا تھا۔ نتیجتاً بقول مشہور امریکی کالم نگار جان چیرین اب اسرائیلی سماج اور زیادہ نسل پرست ہوگیا ہے، وہ کھلے عام جنوبی افریقہ میں رنگ بھید پر مبنی نسلی عصبیت کے زمانہ کے طرز عمل اپنا رہا ہے۔ بہرحال اس دفعہ اقوام متحدہ کی ووٹنگ میں صدر ٹرمپ کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دراصل صدر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سے ہی ٹرمپ نے اپنے خارجہ بجٹ میں عام ضرب کاری لگا رکھی ہے، 2018 کے دوران خارجہ بجٹ میں 28 فیصد کمی کردی گئی ہے، پھر بھی اسرائیل اس کی مالی امداد کا عظیم ترین وصول کنندہ ملک بنا ہوا ہے۔ 2018 میں بھی اسے 31 ارب ڈالر کی امریکی امداد ملے گی جبکہ فلسطینیوں کو اس رقم کے سویں حصہ سے کم یعنی 25 کروڑ ڈالر سے کام چلانا پڑے گا، علاقے کے دیگر ممالک کو اور بھی قلیل رقم ملتی ہے۔ یہ بھی وجہ تھی کہ امریکی دھمکیوں کا ووٹنگ پر اثر نہیں پڑا اور آخرکار امریکہ کو بھرپور شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس کا طویل مدتی سیاسی وسفارتی شاخ درشاخ اثر ہوگا۔ ٹرمپ کے یروشلم والے فیصلہ کی مخالفت میں دسمبر 2017 میں مصر کے ذریعہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں پیش کردہ قرار داد کو امریکہ نے ویٹو (Veto) کر دیا تھا جبکہ باقی تمام 14 ممالک نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ یاد رہے کہ مصر کا شمار سب سے زیادہ امریکی مالی امداد وصول کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے، اسے ہر برس ایک ارب امریکی ڈالر ملتے ہیں، پھر بھی یروشلم پر سیکورٹی کونسل میں قرارداد کو بلم کی نوک پر لے کر آگے بڑھنے سے مصر کو کوئی روک نہیں سکا۔

جنرل اسمبلی میں یروشلم پر امریکہ کے خلاف قرارداد پیش کرنے والے ملک تھے ترکی اور یمن۔ سب جانتے ہیں کہ یمن فی الواقع قائم مقام ہے سعودی عرب کا جو خود امریکہ کا قریب ترین اتحادی ملک ہے اور عرب میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ٹرمپ نے یہ فیصلہ بغیر خاموش سعودی منظوری کے نہیں لیا ہوگا۔ جنرل اسمبلی میں ووٹنگ سے قبل بحرین کے وزیر خارجہ خالد بن احمد خلیفہ نے ٹوئٹ کیا تھا کہ 'عرب ممالک کو غیر اہم معاملات پر توجہ مرکوز کر کے امریکہ سے بے وجہ جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے جبکہ ہم مشترکہ طور پر ایران کے خطرہ کو جھیل رہے ہیں'۔ اس طرح سعودیوں اور اسرائیلیوں کی مدد سے ٹرمپ انتظامیہ سوچے سمجھے پروگرام کے تحت دنیا کو بیجا قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ ایران اپنے علاقہ اور پوری دنیا کے لیے خطرہ ہے، لیکن ٹرمپ کی انتھک کوشش کے باوجود عرب وعجم نے اس موقف کو بجا طور پر مسترد کر دیا ہے۔ حال کے مہینوں میں ترکی نے امریکہ سے دوری بنا لی ہے، سعودی عرب سے بھی اس کے تعلقات فی الحال ہموار نہیں ہیں اور ترکی نے ہی سب سے پہلے یروشلم کا معاملہ بین الاقوامی مجالس میں اٹھانا شروع کیا تھا۔ یروشلم پر ٹرمپ کے فیصلہ کے بعد دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں ترکی نے اسلامی تعاون تنظیم او آئی سی (Organisation of Islamic Cooperation-OIC) کی غیر معمولی چوٹی کانفرنس کی میزبانی کی، جہاں اپنی تقریر میں صدر طیب اردگان نے اسرائیل کو 'دہشت گرد ملک' کا خطاب دیا، او آئی سی نے قرارداد پاس کی کہ دنیا کے ممالک فلسطین کو خود مختار ملک اور مشرقی یروشلم کو اس کے دارالسلطنت کے طور پر تسلیم کریں۔ او آئی سی کی چوٹی کانفرنس میں فلسطین کے صدر محمود عباس نے کہا تھا کہ یروشلم پر اپنے حالیہ فیصلہ کے بعد امریکہ نے مستقبل میں فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان امن مذاکرات میں اپنے کو کسی بھی رول کے لیے نااہل بنا لیا ہے 'اب ہم امریکہ کا کوئی رول تسلیم نہیں کریں گے اس نے اپنے کو اسرائیل کا طرفدار ہونے کا اعلان کر دیا ہے'۔ اس چوٹی کانفرنس میں 20 ممالک کے سربراہ موجود تھے لیکن وہاں سعودی عرب اور اس کے اتحادی ممالک بحرین و متحدہ عرب امارات نے صرف اپنی وزارت خارجہ کے افسروں کو ہی بھیجا تھا۔ سعودیوں نے اپنے دوست اردن پر بھی زور ڈالا تھا کہ وہ بھی کمتر سطح کا وفد بھیجے لیکن اردن نے ان کی بات نہیں مانی۔ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں عرب مطالعہ کے پروفیسر خالد رشید کے مطابق امریکہ مصالحت کے اپنے اس رول کا پہلے تو خوب غلط استعمال کرتا ہی رہا ہے اور اب تو اس نے 'اپنے مصالحت کروانے والے رول کے اعضا خود ہی کاٹ لیے ہیں'۔ فلسطین کے چیف میڈیٹر صائب عریقات نے کہا کہ بین الاقوامی برادری نے قانون کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے، فلسطین عالمی برادری کی مغلوب اکثریت کی پذیرائی کرتا ہے جو باوجود امریکہ کی دھمکیوں اور گھڑکیوں کے فلسطین کے ساتھ کھڑے رہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 01 Feb-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

قلب سلیم کی صدائے بازگشت

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

ملک میں بڑی اکثریت ہندوؤں کی ہے، جس میں سے آدھی عورتیں ہیں، ان میں سے زیادہ عمر والی عورتوں میں سے زیادہ فیصد ناخواندہ ہے، پڑھی لکھی نہیں ہیں۔ کل ہندو آبادی میں بڑی فیصد نوجوانوں کی ہے، جن میں سے بہت بڑی تعداد کے پاس روزگار نہیں ہے۔ لہٰذا ملک میں کروڑوں ہندو عورتوں، لڑکے لڑکیوں اور مردوں کے پاس اپنا کوئی ایجنڈا نہیں ہے۔ اس خلا کو سنگھ پریوار اور بی جے پی کی مرکزی و19 صوبائی حکومتوں نے اب پُر کردیا ہے۔ اس پروجیکٹ پر کام تو وہ عرصۂ دراز سے کر رہے تھے لیکن 2014-18 کے دوران اس بے حرکتی کو مثبت مصروفیت میں منتقل کردیا گیا ہے۔ ہاں بین الاقوامی سطح پر تھوڑی بہت مجبوریاں ہیں، جن کی ہلکی پھلکی پاسداری کرلی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا مستقل رکن بھی بننا ہے جہاں اسرائیل کی کرختگی نہیں بلکہ مسلم ممالک کی تعداد ہی کام آنی ہے۔ مثبت عنوان اجودھیا اور گئوماتا کے مستقل جشن کے ذریعہ اور ساتھ ہی منفی عنوانوں طلاق ثلاثہ، یکساں سول کوڈ، لنچنگ، اسرائیل دوستی، حج سبسڈی کا اختتام، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار پر سوال کے ذریعہ سنگھ پریوار نے خصوصاً بے ربط بکھرے ہوئے ناخواندہ و بے روزگار ہندوؤں کو روحانی و جذباتی مصروفیت ورنہ لذت جلادی تو مہیا کرہی دی ہے، اسی کرشمہ کو انیسویں صدی میں فرانسیسی تاریخ داں الکسی ڈی ڈوکول نے نام دیا تھا ’اکثریت کا جبر‘۔ آج وہاٹس ایپ پر پڑھے لکھے لوگ بھی اسی دھارے میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ پریوار نے ہندو سماج کی کایا پلٹ کردی ہے، وہ ’مسلم مکت بھارت‘ کی ہوڑ میں لگا ہوا ہے۔ ہاں ایک ہندو طبقہ ہے جو مسلمانوں کے دکھ درد کو سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے، ان کی آواز بھی بنتا ہے لیکن اس کی تعداد کم ہے، پھر بھی اللہ تو مچھر سے بھی کام لے لیتا ہے۔ ادھر کچھ مسلمان پانی کے بہاؤ میں بہنے سے اپنے کو روک نہیں سکے، چار چھ تو پیش بینی پر مبنی ٹی وی بحثوں میں کام آ گئے اور اس پر ستم یہ کہ مسلمانوں کی بہت بڑی فیصد نے اپنی ذاتی بقا کے لیے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر سمجھا ہے۔

”سنگھ پریوار نے یقیناً ملک کا سیاسی ایجنڈا تبدیل کردیا ہے۔ مرض کی یہ صحیح تشخیص ہم جتنی جلدی ذہن نشین کرلیں گے اتنا ہی بہتر اور جلد اس کا علاج کرنے میں آسانی ہوگی۔ ملک میں ووٹوں کی گنتی اگر جالی دار طریقہ سے کی جائے تو مسلمانوں کے لیے جارحانہ سنگھ کے شیوہ سے محفوظ رہنے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو ان کی جست کاری میں سیندھ لگائی جائے، ورنہ اپنے کو آپس میں ضم کرلیا جائے۔“

سنگھ پریوار نے یقیناً ملک کا سیاسی ایجنڈا تبدیل کردیا ہے۔ مرض کی یہ صحیح تشخیص ہم جتنی جلدی ذہن نشین کرلیں گے اتنا ہی بہتر اور جلد اس کا علاج کرنے میں آسانی ہوگی۔ ملک میں ووٹوں کی گنتی اگر جالی دار طریقہ سے کی جائے تو مسلمانوں کے لیے جارحانہ سنگھ کے شیوہ سے محفوظ رہنے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو ان کی جست کاری میں سیندھ لگائی جائے، ورنہ اپنے کو آپس میں ضم کرلیا جائے۔ وہ اپنی حکمت عملی پر 93 برس سے کام کرتے آرہے ہیں اور ہم اب بھی پوری طرح سوچ بھی نہیں رہے ہیں کہ کون سا توڑ لائیں۔ ہندوتو کا بخار اس قدر شدت وحدت سے ہر طرف پھیل گیا ہے کہ اسے اب ہندوستانی سماج کے صحت یاب ہونے کی نشانی مانا جانے لگا ہے۔ اس صورت حال میں کانگریس یا کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ بغیر ہندوتو کو کسی نہ کسی حد تک قبول کیے ہوئے الیکشن میں کسی خاص فتح کی امید کرسکے۔ ملت کے لیے آج کا منظر وسیع ریگستان ہے، ریت، طوفان، سراب، بچھو، سانپ، ناگ پھنی، آلودہ پانی، دھوپ کی جلن، آنکھوں کی سوزش اور ذہنی دباؤ۔ ہماری بقا اسی میں ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر جو بھی تھوڑا بہت ساز و سامان ہے، اسی میں ضروری تبدیلی کرکے ہم اپنے درماندہ ملی کارواں کو ظلمت شب میں سے بچا کے نکال لے جائیں، یہ ممکن ہے بشرطیکہ ہماری آہ شرر فشاں ہو اور ہمارا نفس شعلہ بار ہو۔ ریگستان کی ریت کے چکرویوہ میں خود کے غائب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، ایسے میں منہ اور ناک کو کپڑے سے بند کر لینا چاہیے، ضروری ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ یا لیٹ لیا جائے اور پھر چل پڑے۔ سراب کے جائے وقوع جاننے کے لیے طلوع آفتاب سے قبل یا غروب کے بعد سروے کیا جانا چاہیے۔ افسوس کہ ہم میں سے زیادہ تر کو معلوم ہی نہیں کہ طارق بن زیاد کون تھے اور مسلمانوں کی تاریخ میں ان کا کیا رول رہا ہے۔ کچھ امید کی کرنیں ہیں، رعنا ایوب چاہتی تو وہ بھی، اپنے زمانہ شباب میں جب سب بچے دنیا سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، وہ اپنی ذاتی بقا کو داؤ پر نہ لگاتی لیکن اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اس کی جلائی ہوئی پھلجھڑی نے سپریم کورٹ کے چار سینئر ترین ججوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا۔ رعنا میں وہی جنون ہے جو طارق بن زیاد میں تھا۔ اس کی والدہ نے اردو اخبار میں پڑھ کر اسے سہراب الدین معاملہ کی خبر دی، بس اس پر رعنا کمربستہ ہوئی اور گنگناتی ہوئی چل دی (ترمیم کے لیے معذرت کے ساتھ): ’آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتی ہوں میں‘۔ یہ بچی اب ملت کا مایۂ ناز سرمایہ ہے، اس کی بھرپور پذیرائی ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم میں سے کثیر تعداد میں لوگ وہاٹس ایپ پر میسیج فارورڈ کرنے کو سمجھتے ہیں کہ ملت کے تئیں ان کا فرض ادا ہوگیا۔

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری دینداری، جسے عموماً صدقہ کہتے ہیں، کی وسعت مومن کو خود مقرر کرنی ہے۔ لیکن اس کے لیے قُلِ العَفو کا رہنما اصول سورۂ بقرہ کی آیت 219 میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سنسکرت و ہندی زبان کا ایک بہت خوبصورت، عنقا و پر معنی لفظ ہے ’شردھا‘۔ اردو میں اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے جن تصورات کو جوڑنا ہوگا وہ ہیں تعظیم و تکریم، اطاعت و فرمانبرداری، زہد و تقویٰ، ایمان و دیانت، پاس و لحاظ اور خراج و نیاز، تو اپنے مال کی زکوٰۃ دینے کے بعد جو 97.5 فیصد مال بچتا ہے اس میں سے ہم کتنا اللہ کی راہ میں خرچ کریں، یہ طے کرنے کے لیے ہمارے مالک حقیقی نے ہمیں ہمارے ظرف کو بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ یہاں ہمارا فیصلہ یہ دکھائے گا کہ ہمیں ہمارے پروردگار سے کتنی شردھا ہے۔ ہم اس کی کتنی تعظیم و تکریم اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں، ہم میں کتنا زہد و تقویٰ ہے، ہمارا ایمان کتنا پختہ ہے اور ہم اسے کتنا خراج دینا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ذہن نشین رکھنا ہے کہ یہ اختیاری دینداری صرف مال و دولت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر انسان کو اپنے وقت، ذاتی ذرائع، لیاقت، اثاثہ اور اپنے جذبۂ محبت میں سے بھی ضرورت مندوں کے لیے صدقہ کرتے رہنا ہے۔ اس بنیادی قرآنی تصور کو عوامی غور و خوض کے دائرہ میں لانے کے لیے علامہ اقبال نے آج سے تین چوتھائی صدی قبل ہی کہا تھا:

جو حرف قُلِ العَفوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

افسوس کہ پھر بھی یہ حکم الٰہی اب تک ہمارے مسلم معاشرہ میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ ہم میں سے کسی کی دولت زکوٰۃ کے بنیادی نصاب سے ذرا ہی زیادہ ہے، کسی کی دولت نصاب سے دس گنا ہے، کسی کی ہزار گنا، کسی کی لاکھ گنا، لیکن ذاتی انسانی ضرورت کم و بیش ہر فرد کی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے نشاندہی کردی کہ تمہاری واجب و جائز ضروریات سے جو زائد ہو وہ صدقہ کردو۔ جن کو اللہ نے اپنی دولت کا کفیل نہیں بنایا اور جنھیں ہم دنیا میں ضرورتمند کہتے ہیں، ان کی تعداد بے انتہا ہے۔ مظفر نگر، شاملی، آسام کوکراجھار، میانمار (برما) اور وسط افریقہ میں خدا کی نحیف و نادار مخلوق زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ہم ہیں کہ بیٹھے ہوئے حساب لگا رہے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ کہیں 2.5% سے زیادہ نہ ہوجائے۔ آئیے کوشش کریں کہ ہم اپنے صدقہ سے ملت کے لیے طویل مدتی ادارہ سازی میں شامل ہوجائیں نہ کہ صرف انفرادی متفرقات پر اکتفا کرکے ہمارے صدقہ کا اثر خلا میں بکھر جائے۔ یاد رکھیں ’پہلے خود کیجیے پھر دوسرے سے کرنے کو کہیے‘۔ ہمیں دکھا دینا ہوگا کہ ہماری دلچسپی اُس ہندوستانی قومیت میں ہے، جو ثقافتی نہیں، بلکہ آئینی ہے۔ ہم اپنے خون پسینہ سے ملک کو اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ تناسب میں ترقی دیں جسے گلیشیر کی طرح کوئی روک نہ پائے، اس طرح آشکارہ ہوگی ہماری آئینی قومیت۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 08 Feb-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

قومی معیشت: رگھورام راجن کی تشریح

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

ریزرو بینک آف انڈیا کے سابق گورنر رگھورام راجن جو اب واپس شکاگو میں پروفیسر بن گئے ہیں، انھوں نے سوئزرلینڈ کے شہر ڈیواس میں حالیہ عالمی اقتصادی چوٹی کانفرنس کے دوران ایک ٹی وی انٹرویو میں بتایا کہ گزشتہ برس دنیا بھر میں اقتصادی صورت حال میں اچھال آیا، لیکن ہندوستان اس سے استفادہ نہیں کرپایا کیونکہ نوٹ بندی کے اثرات حاوی رہے اور جی ایس ٹی کے نفاذ میں اب تک دقتیں پیش آرہی ہیں۔ یہ دونوں عناصر باد مخالف بن گئے ہماری اقتصادی نشو ونما کے لیے، جبکہ اسی دوران دیگر متعدد ممالک نے اپنی قدرو قیمت میں اضافہ کرلیا۔ ساتھ ہی تیل کی عالمی قیمت میں اب تیزی آگئی ہے جس کا منفی اثر بھی ہماری اقتصادی حالت پر ضرور پڑے گا کیونکہ جب تیل کی قیمت گھٹی تھی تب ہم نے اس کا فائدہ اٹھایا تھا اور ملک کو بتایا تھا کہ قومی پیداوار یعنی جی ڈی پی (GDP) بڑھ گئی ہے، لیکن ابھی تک تیل کی بڑھی ہوئی قیمت ہماری موجودہ اعلان شدہ جی ڈی پی میں سے گھٹائی نہیں گئی ہے، جلد گھٹانی تو پڑے گی۔ نوٹ بندی کی وجہ سے بہت سے کاروبار ختم ہوگئے جن کا اندراج بھی ہماری جی ڈی پی میں اب تک نہیں ہوا ہے، ہاں نوٹ بندی کی وجہ سے آن لائن پیمنٹ میں اضافہ ہوا لیکن اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

رگھورام نے کہا کہ جب وہ ریزرو بینک کے گورنر تھے تو حکومت نے ان سے نوٹ بندی کے لیے کہا تھا، لیکن انھوں نے منع کردیا تھا۔ ریزرو بینک اور وزارت خزانہ کی افسر شاہی کے درمیان ہمیشہ ہی کشتی ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے ریزرو بینک کی خودمختاری کشمکش میں رہتی ہے۔ گزشتہ 10-15 برس میں ہم نے مختلف ہدایات واعمال کے ذریعہ اپنے سسٹم میں مضبوطی (Macro-stabilisation) تو بنالی ہے، سرکاری خزانہ میں خسارہ (Fiscal deficit) پر بھی ہم نے قابو پالیا ہے، افراط زر (Inflation) کو کم کرنے کے لیے بھی ہم گامزن رہے ہیں، لیکن زمینی سطح پر نفاذ (Micro-implementation) میں دقتیں اب بھی ہیں۔

ہمارے یہاں سرکاری افسر فیصلے لینے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ فی الحال فیصلہ سازی میں مرکزیت بہت زیادہ ہے، اسی وجہ سے دہلی ممبئی انڈسٹریل کاریڈور اب تک نہیں بن پایا، یہ سب نفاذ کی خرابی ہے جبکہ اس میدان میں چین بہت مضبوط ہے۔ اگر زمین حاصل کرنے میں ہمیں دقت ہوتی ہے تو ہم زمین کے حصول والے قانون میں ترمیم کیوں نہیں کرتے۔ تعمیری پروجیکٹوں سے لاکھوں لوگ روزگار سے جڑیں گے، لیکن ہم اسے بڑھاوا نہیں دے رہے ہیں۔ ہم چاہیں تو پورے ملک میں چوبیس گھنٹے بجلی مہیا کرسکتے ہیں، جو لوگ بجلی خرچ کریں گے ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا، جو بجلی پیدا کریں گے ان کو اپنی آمدنی میں سے بینک کا قرض ادا کرنا ہوگا۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بجلی کی تقسیم کرنے والی کمپنیاں ٹھیک کام نہیں کررہی ہیں، اس کے ازالہ کے لیے حکومت کو ضروری کارروائی کرنی ہوگی۔ ملک کی اقتصادی بالیدگی میں فی الوقت جو کمی ہے، اس سے قبل رفتار بالیدگی 8 فیصد تھی وہ دوبارہ لائی جاسکتی ہے اگر ہماری نوجوان نسل کو صحیح کارجوئی (Entrepreneurship) میں لگایا جائے۔ پھر بھی ملک میں روزگار کی جتنی کمی ہے، اسے پر کرنے کے لیے رفتار بالیدگی کو بڑھا کے 9-10 فیصد تک لے جانا ہوگا۔ اس کے لیے زمینی سطح کے نفاذ میں اصلاحات کرنی ہوں گی۔ سب سے اہم ہے تعلیم، ہمیں بہترین طالب علم پیدا کرنے ہوں گے۔ بچوں کو ناکافی غذائیت (Malnutrition) سے بچانا ہوگا تاکہ ان میں جسمانی اور دماغی مضبوطی ہوسکے، اگر یہ یقینی نہیں بنایا گیا تو تعلیم پر توجہ پوری طرح سے کارآمد نہیں ہوگی۔ چین کے مقابلہ میں ہمارا اقتصادی پھیلاؤ 1/5 ہے۔

دیگر ممالک کے مقابلہ میں عالمی فراہمی کی زنجیر (Global supply chain) میں ہماری عملداری میں کمی ہے۔ ان سے مقابلہ میں آنے کے لیے ہمیں اپنا بنیادی ڈھانچہ اعلیٰ درجہ کا بنانا ہوگا۔ چین کے پاس تکنیکی تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی نہیں ہے، اس نے گاؤں گاؤں میں کاروباری مہم کی لہر دوڑا دی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم چین کی مکمل نقل کرلیں، ہاں اگر ہم تعمیر کو ترجیح دیں، اپنا بنیادی ڈھانچہ صحیح کرلیں اور چوبیس گھنٹہ بجلی کا انتظام کرلیں تو بھی ہمارا کام چل پڑے گا۔ ہمیں کون کون سے اقدامات کرنے ہیں، اس کے لیے ہمیں رائے عامہ بنانی ہوگی۔ حکومت کے وزیر کہتے ہیں کہ 2022 تک ہر کسان کی آمدنی دوگنی ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لیے ملک کی کل زراعتی زمین کو ضروری حد تک نم رہنا ہوگا جو موجودہ صورت حال میں ہو نہیں سکتا، اس کا منفی اثر کسی حد تک حالیہ گجرات الیکشن نتائج میں دیکھنے کو ملا، پھر بھی اس کا یہ حل ہرگز نہیں ہے کہ پہلے کسانوں کو مقروض بناؤ پھر ان کے قرضے معاف کردو، یہ تو اندرون خزانہ ہیر پھیر سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہمیں تحقیق کرنی ہوگی کہ کس مخصوص زراعت کے لیے کھیت کا مناسب سائز کیا ہو، ہمیں کسانوں کو کھیت سے نکال کر انڈسٹری میں لگانا ہوگا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر امریکہ کے کھیتوں میں ملک کے 40 فیصد لوگ نظر آتے تھے جبکہ اب وہاں صرف 3-4 فیصد لوگ ہی پائے جاتے ہیں جو 40 فیصد لوگوں سے زیادہ پیداوار کرتے ہیں۔ فی الوقت دنیا بھر میں شرح سود بڑھ رہی ہے، ہمارا ملکی بازاری ماحول بظاہر آسودہ نظر آرہا ہے، دیر سویر ہمیں اس سراب کو پہچاننا ہوگا اور خواب خرگوش سے جاگنا ہوگا، جن پروگراموں کا اعلان ہوچکا ہے، انھیں کامیاب کرنے کے لیے محنت کرنی ہوگی، بجلی کی تقسیم والی اُجول ایشیورنس یوجنا (UDAY) میں کیا رکاوٹیں ہیں، سمجھ کے انھیں دور کرنا ہوگا۔ اس طرح ہندوستان کی بیرونی تصویر میں بھی سدھار آسکے گا۔

> ”چین کے پاس تکنیکی تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی نہیں ہے، اس نے گاؤں گاؤں میں کاروباری مہم کی لہر دوڑا دی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم چین کی مکمل نقل کرلیں، ہاں اگر ہم تعمیر کو ترجیح دیں، اپنا بنیادی ڈھانچہ صحیح کرلیں اور چوبیس گھنٹہ بجلی کا انتظام کرلیں تو بھی ہمارا کام چل پڑے گا۔ ہمیں کون کون سے اقدامات کرنے ہیں، اس کے لیے ہمیں رائے عامہ بنانی ہوگی۔“

رگھورام راجن کے مطابق عالمی سطح پر اقتصادی حالات قدرے بہتر ہیں، لیکن پھر بھی ان کا ذہن وہاں بھی مطمئن نہیں ہے۔ 2008 کے عالمی اقتصادی بحران کے بعد سے سب نے مل کے بینکوں کو ڈھرّے پر واپس لانے کی کوشش کی، لیکن تمام بینکوں میں یکساں قاعدہ نافذ نہیں ہوپایا، نظام زر کی پالیسی کی اندیکھی ہوگئی، شرح سود 8 برس تک بہت نیچے رہی، گورنمنٹ کے بانڈ بکنے لگے، سماج کو ادھار کو بڑھاوا دینے اور آسان مائعیت (Easy liquidity) کے نشے کی عادت پڑنے لگی۔ رواں سال کے اختتام تک یوروپین سینٹرل بینک کام کرنا بند کردے گا، اس نے سرکاری بانڈ خرید رکھے ہیں جس کی وجہ سے جو اقتصادی صورت حال بہتر نظر آرہی ہے وہ واپس تنگی کی طرف مائل ہوجائے گی، بینک آف جاپان اس پر شور مچا رہا ہے لیکن اس کو بھی مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑیں گے، پھر بازار مندا پڑنے لگے گا۔ راجن نے مشہور عالمی سرمایہ کار کمپنی الائنز (Allianz) کے سی ای او محمد العریان کے ذریعہ استعمال کیے گئے الفاظ ”ہاں لیکن“ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ عالمی اقتصادی صورت حال میں جو ملک مضبوط ہیں وہ اور زیادہ مضبوط ہورہے ہیں، ایسے منظر نامہ میں ہمارے ہندوستانی ایکسپورٹ کے لیے بظاہر اچھے مواقع دکھائی دے رہے ہیں، لیکن عالمی اقتصادی سسٹم میں جلد ٹوٹنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی ہے جس کو مدنظر رکھنا ہوگا، مثلاً بٹ کوائن (BitCoin) کی دراصل زیادہ اہمیت نہیں ہے پھر بھی وہ بڑھ کر 20,000 ڈالر تک گیا پھر اچانک گھٹ کے آدھا ہی رہ گیا، جہاں بھیڑ جمع ہونے لگتی ہے وہاں سرمایہ کی قیمت کم ہونے کا خطرہ بڑھنے لگتا ہے، یہی حال میوچول فنڈ اور پنشن فنڈ کا ہوا ہے۔ ایپل، گوگل، ایمیزن، مائیکروسافٹ کمپنیوں کا موجودہ کل اثاثہ 35 کھرب ڈالر ہے، یہ کمپنیاں عوام کو بہت سی خدمات مفت مہیا کررہی ہیں لیکن اس کی قیمت کوئی تو ادا کرتا ہے، یہ بھی سوچنا ہوگا کہ ان کی موجودگی میں چھوٹی کمپنیوں کے آگے بڑھنے کے مواقع کتنے گھٹ گئے ہیں، لہٰذا ان بڑی کمپنیوں پر کچھ تو قواعد لگنے چاہئیں۔ چین اپنے یہاں وہاٹس ایپ، انٹرنیٹ اور ای کامرس کی اجازت نہیں دیتا ہے، اس نے خود ہی علی بابا جیسی بہتیری کمپنیاں قائم کردی ہیں، وہاں ایک مقامی کمپنی نے اوبر کو خرید لیا ہے۔ ہمارا ہندوستان سب کے لیے ہرا قالین بچھائے ہوئے ہے، ساتھ ہی اپنی دیسی کمپنیاں جیسے فلِپ کارڈ اور اسنیپ ڈیل بھی خوب چل رہی ہیں، کہا نہیں جاسکتا کہ کون سا ماڈل بہتر ہے۔ ہاں ہمیں اپنے یہاں ڈیٹا کو محفوظ رکھنے کا معقول انتظام کرنا ہوگا۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 15 Feb-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

امریکی اقتصادی اتار چڑھاؤ کے ملک و دنیا پر اثرات

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

چند روز قبل تک امریکہ میں شیئر مارکیٹ کا بازار گرم تھا، جس کی خاص وجہ تھی اس بازار کے متعلقہ قاعدوں پر ضرب لگانے اور شیئر آمدنی پر ٹیکس میں کمی کر دینے سے متعلق صدر ٹرمپ کا رجحان اور نتیجتاً اقتصادی طور پر دنیا کے ہر اہم خطہ میں معیشت میں بظاہر پھیلاؤ دکھائی دے رہا تھا۔ سرمایہ کار نادان بھرم میں پڑ گئے تھے کہ شاید منڈی کے خدشات پر قابو پا لیا گیا ہے اور وہ بے فکر ہو کر اندھا دھند سرمایہ کاری میں لگ گئے۔ اچانک معلوم ہوا کہ منڈی کے خطرات اندر سے سرنگ کھود رہے تھے۔ ایشیا، یوروپ اور امریکہ میں دس سال کا وہ وقفہ دراصل اختتام پذیر تھا جس کے دوران مرکزی بینکوں کی کارستانی کی وجہ سے رقم کو آسانی سے حاصل کیا جا سکتا تھا اور اب وہ دور شروع ہو گیا جب کمپنیوں کو رقم ادھار لینے کے لیے اور عوام کو انفرادی طور پر گھر، کار وغیرہ فائنانس کرنے کے لیے زیادہ سود دینا پڑ رہا ہے۔ اگر ہمیں آج نیویارک سے لندن و ٹوکیو تک شیئر بازاروں میں ایک جانب سے دوسری جانب زبردست بدلاؤ کو سمجھنا ہے تو ہمیں مندرجہ بالا حقیقت کو ذہن نشیں کرنا ہی ہوگا۔ دریں اثنا سرمایہ کاروں کی سمجھ میں آنے لگا کہ پہلے امریکہ میں اور پھر یوروپ اور ایشیا میں سود کی شرحیں ان کے اندازہ سے زیادہ تیز رفتار سے بڑھیں گی، لہٰذا وہ شیئر بازار میں سے اپنی رقم نکال کر دولت کے متبادل محفوظ مخزنوں میں یا اسے بانڈ میں لگانے لگے۔ گزشتہ ہفتہ نیویارک میں شیئر بیچنے کی لہر چل پڑی، وہ تین روز میں یوروپ اور ایشیا میں چھا گئی اور پھر دنیا کا چکر لگا کر جہاں شروع ہوئی تھی وہیں واپس پہنچ گئی لیکن اپنی تیزی میں کچھ گراوٹ کے ساتھ۔ دنیا بھر میں افراتفری جاری رہی لیکن اس دوران امریکہ کو قدرے چین مل سکا کیونکہ وہاں اسٹینڈرڈ اینڈ پوئر (Standard & Poor) کی 500 اسٹاک انڈکس 1.7 فیصد اوپر چڑھ گئی، اس سے کسی حد تک نقصان کی تلافی ہوئی حالانکہ پہلے کی اپنی چوٹی کے مقابلہ میں اسٹینڈرڈ اینڈ پوئر کی 500 اسٹاک اب بھی 6 فیصد کم چل رہی ہے۔

یہ سمجھنے کے لیے کسی اعلیٰ تعلیمی ڈگری کی ضرورت نہیں ہے کہ شیئر مارکیٹ اوپر بھی جاتی ہے اور نیچے بھی آتی ہے گوکہ کوئی ایک ریکارڈ ٹوٹنے پر بہت زیادہ خوش کن جشن میں وقت کی حقیقت کبھی چھپی بھی رہ جاتی ہے۔ امریکہ میں شیئر کی حالیہ آوارہ گرد سودے بازی سے وہاں یقیناً لوگوں کے کان کھڑے ہو جانے تھے، لیکن پیسہ بیرون امریکہ بھی جن جن ہاتھوں میں جاتا ہے سب جگہ دلوں کی دھڑکنیں تو بڑھنے ہی لگیں۔ ماضی قریب میں امریکی معیشت نے ہیبت ناک چوکسی کی اہمیت کو اسٹاک مارکیٹ کے تمسخر پر بلی چڑھا رکھا تھا جس کا نتیجہ ہوا تاریکی و اضطراب۔ لندن میں مقیم گلوبل میکرو اسٹریٹیجی کے ڈائرکٹر برائے آکسفورڈ اکنامکس (Director, Global Macro Strategy for Oxford Economics) گورو سرولیا نے کہا ہے کہ امریکہ کا شیئر مارکیٹ دنیا میں سب سے بڑا ہے، اگر وہاں شیئر بڑی تعداد میں بیچے جا رہے ہیں تو پوری دنیا میں سرمایہ کاری پر اس کا زبردست منفی اثر ہوتا ہے۔ سرمایہ کار اب سمجھ پائے کہ ان کے مالی نقصان کا کھیل تمام مرکزی بینک خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں اور جب مصیبت ان سرمایہ کاروں کے سر پر آ جاتی ہے تب یہ بینک سود بڑھا کر اپنا مقصد پورا کر لیتے ہیں۔ 2008 میں شروع ہوئے مالی بحران کے دوران امریکی فیڈرل ریزرو بینک اور یوروپین سینٹرل بینک و دیگر مرکزی بینکوں نے بڑھ چڑھ کر ادھار دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے دنیا میں بظاہر اقتصادی بالیدگی بڑھنے لگی، لیکن جب وہ پروان چڑھنے لگی اور شیئر مارکیٹ میں اتنا اچھال آنے لگا کہ اس کی رفتار کھیل کے بنیادی اصولوں سے تجاوز کرنے لگی تب مرکزی بینکوں نے سود کی شرحیں خوب بڑھا کے کھیل بگاڑنا شروع کر دیا تاکہ وہ خود نقصان سے بچ جائیں۔

سود کی شرحیں بڑھنے کی وجہ سے ادھار لینا مہنگا ہو جاتا ہے، اس کی وجہ سے اقتصادی ترقی کی رفتار میں کمی آ جاتی ہے، شیئر خریدنے میں لوگوں کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے کیونکہ کمپنیوں کو اپنی دینداری پر کنٹرول رکھنے کے لیے ادھار کی زیادہ بڑی رقم چکانی ہوتی ہے۔ سرمایہ کار اسے بہتر سمجھتے ہیں کہ اپنا پیسہ کیش میں رکھیں یا بانڈ میں لگا دیں بجائے اس کے کہ وہ شیئر کی قیمتیں کم ہونے سے اپنا نقصان کر لیں۔ موجودہ صورت حال کی ایک کڑوی حقیقت یہ ہے کہ اس کی شروعات اس خوش گوار نمود سے ہوئی جس کے لیے دنیا سالہا سال سے منتظر تھی، یعنی مزدوروں و ملازموں کے لیے زیادہ اجرت۔ اسی ہفتہ امریکہ کے محکمہ محنت نے اعلان کیا کہ گزشتہ برس کے مقابلہ میں فی الوقت مزدوروں کی اجرت میں 2.9 فیصد اور دیگر پرائیویٹ تنخواہوں میں 2.8 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اس پورے سلسلہ کے دوران بے روزگاری گھٹنے لگی تو برطانیہ، جاپان اور امریکہ کی کمپنیوں نے ایسا نیا مال بنانا شروع کر دیا اور اسے اس طور پر بیچنا شروع کر دیا کہ انھیں مزدوروں کو زیادہ اجرت نہیں دینی پڑے۔ ظاہر ہے اس سے مزدور طبقہ ناخوش ہونے لگا۔ انھیں خوش رکھنے کے لیے امریکی کمپنیوں کو اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑی، لہٰذا اجرت و تنخواہیں بڑھائی گئیں، امریکی صارفین کو زیادہ خرچ کرنے کے مواقع ملنے لگے۔ وہ لوگ زیادہ مکان اور کاریں خریدنے لگے، تعمیری میدان میں اور آٹو پلانٹس میں نوکریاں بڑھنے لگیں، ریسٹورینٹ میں بھیڑ بڑھنے لگی، کھانے پہنچانے کے لیے زیادہ ٹرک ڈرائیوروں کی ضرورت پڑنے لگی، ٹرکوں کے لیے زیادہ مکینکوں کی ضرورت پڑنے لگی۔ امریکہ میں زیادہ کاریں بننے کی وجہ سے میکسیکو میں زیادہ بریک لائنیں بننے لگیں، چین میں بجلی کے تاروں کے زیادہ سرکٹ بننے لگے، اس کے لیے چیلی میں تانبے کی زیادہ کھدائی ہونے لگی۔ زیادتی تعمیرات کی وجہ سے جرمنی اور جاپان میں تعمیر سے متعلق زیادہ مشینیں بننے لگیں، برازیل میں کچے لوہے کی زیادہ کھدائی ہونے لگی۔

اس باہمی انحصار سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ امریکہ کی معیشت بہتر ہونے کی وجہ سے دنیا میں جگہ جگہ اقتصادی بہتری ہونے لگی۔ لیکن امریکہ میں تنخواہیں بڑھنے سے دنیا بھر میں قیمتوں میں اضافہ بھی ہونے لگا، جس کی وجہ سے ملکوں کی اقتصادی حالت میں بگاڑ آنا شروع ہو گیا، اور مرکزی بینکوں نے پھر سود کی شرحیں بڑھا دیں، نتیجتاً دنیا کی اسٹاک مارکیٹ گھٹنے لگی۔ اب یوروپ اور جاپان کے سینٹرل بینک بھی سود کی شرحیں بڑھا سکتے ہیں۔ اگر امریکی کمپنیوں جنرل الکٹرک اور فورڈ وغیرہ اپنے شیئر کی قیمت گھٹتے ہوئے دیکھتی ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے مزید پھیلاؤ پر روک لگا دیں، تو تائیوان میں بننے والی کمپیوٹر چپس (Computer chips) میں کٹوتی کرنی ہوگی، جنوبی کوریا میں بننے والی فلیٹ پینل ڈسپلے اسکرین (Flatpanel display screen) کم بننے لگیں گی، اور چیکوسلواکیہ میں بننے والے آٹو پرزے (Auto parts) کم بننے ہوں گے، اور پھر اس سلسلہ کی کڑی کے طور پر ارجنٹینا، ہندوستان اور جنوبی افریقہ سے نکلنے والے خام مال (Raw material) کی مقدار میں کمی کرنی پڑے گی۔ اسی کو کہتے ہیں سپلائی کی عالمی زنجیر (World supply chain) جس کا آج کی دنیا میں اندرونی طور پر بہت زیادہ باہمی انحصار ہے۔ بقول نیویارک ٹائمس کے اس صورت حال سے دو خطرات جنم لیتے ہیں: اول، آئندہ جب کبھی اقتصادی پس روی (Recession) کا دور آتا ہے تو اس سے نمٹنے کے لیے سسٹم میں لچک کا فقدان اور دوم بڑھی ہوئی شرح پر سود دینے کی وجہ سے مرکزی خزانہ پر بوجھ اقتصادی بالیدگی پر منفی اثر ڈالے گا۔ ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ نئے امریکی بجٹ میں 1.3 کھرب کا مالی خسارہ رہے گا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ صدر ٹرمپ ٹیکس میں چھوٹ دیے جا رہے ہیں جبکہ صدر اوباما کی پالیسی اس کے خلاف تھی۔ انھی خطوط پر ہمیں اپنے ہندوستان میں بھی قومی اقتصادی تجزیہ کرنا ہوگا۔ ٹیکس میں تو ہم بھی چھوٹ دئے جا رہے ہیں، یہ بھی معلوم کرنے کی اہمیت ہے کہ قومی پیداوار یعنی جی ڈی پی (GDP) اور قومی دینداری (National Debt) کی نسبت گزشتہ برسوں کے مقابلے میں اب کیا ہے اور اگلے برس میں کیا ہونے والی ہے۔

□❖□

"اس باہمی انحصار سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ امریکہ کی معیشت بہتر ہونے کی وجہ سے دنیا میں جگہ جگہ اقتصادی بہتری ہونے لگی۔ لیکن امریکہ میں تنخواہیں بڑھنے سے دنیا بھر میں قیمتوں میں اضافہ بھی ہونے لگا، جس کی وجہ سے ملکوں کی اقتصادی حالت میں بگاڑ آنا شروع ہو گیا، اور مرکزی بینکوں نے پھر سود کی شرحیں بڑھا دیں، نتیجتاً دنیا کی اسٹاک مارکیٹ گھٹنے لگی۔"

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

دوراہے پر ملک، آگے کا روڈ میپ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”کرناٹک کے شوارودرمہاسوامی گالو نے صلح حدیبیہ کی روح کی مثال دے کر کہا کہ جب حضور اقدسؐ نے طے کیا کہ بجائے جنگ کے اہل قریش کو دل سے جیتا جائے۔ دراصل اس تجویز کو مسلمانوں کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اسے صرف ایک عارضی حکمت عملی مانا جائے‘ ورنہ مسلمان تو ’لاتخف‘ میں یقین رکھتا ہے‘ مسلمانوں کی طاقت کو نہ دنیا سمجھی ہے اور نہ ہمارا ملک۔ جوقوم روز پانچ دفعہ محلّہ محلّہ‘ ہفتہ میں ایک دفعہ بڑے گروپ میں اور سال میں دو دفعہ ہجوم بنا کر‘ پوری عمر جمع ہو کر مالک حقیقی کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے اور اس کے لئے وضو اور نماز کے ذریعہ اپنے کو جسمانی و روحانی طور پر تندرست وتوانا رکھتی ہو اس پر کون سبقت لے جاسکتا ہے۔“

جمعیۃ علما ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی نے دو روز قبل دہلی میں آئی ٹی او پر واقع اپنے دفتر کے بڑے ہال میں پورے ملک سے مع ہندو سنتوں وسماجی کارکنوں کے مختلف مذاہب کے 100 سے زائد سماجی رہنماؤں کو مدعو کر کے سات گھنٹے تک محفل مذاکرہ کا اہتمام کیا، جس میں فی الوقت ملک میں چند سماج دشمن عناصر کے ذریعہ باہمی نفرت پھیلانے کی غیر انسانی مصنوعی کوششوں سے نمٹنے کی خاطر آئندہ کا روڈ میپ تیار کرنے کی غرض سے کھل کر گفت وشنید ہوئی۔ ہندو مذہب سے شوارودرمہاسوامی گالو‘ سریش کھیرنار‘ اشوک بھارتی‘ ڈاکٹر چندر پال‘ سوامی اگنی ویش‘ پروفیسر کنچن الاہیہ‘ پرکاش امبیڈکر‘ بیلا نائک تیجاوتھ‘ ڈاکٹر اوشا سنگھ‘ ایڈووکیٹ، اشوک اروڑہ‘ رام پنیانی‘ ہرش مندر ومتعدد سابق آئی اے ایس و آئی پی ایس افسر شامل تھے۔ کم وبیش ایسی ہی نمائندگی دیگر اقلیتوں کی تھی اور مع مولانا ارشد مدنی کے مسلمانوں کی تو تمام ملک گیر تنظیموں کے علاوہ شائد ہی کوئی گوشۂ فکر بچا ہو جس کی بھرپور نمائندگی نمایاں خواتین وحضرات کے ذریعہ نہ ہوئی ہو۔ شیڈیولڈ کاسٹ وشیڈیولڈ ٹرائب کی طرف سے زبردست مطالبہ کیا گیا کہ ہم اپنے ملک کے لئے لفظ ہندوستان کہنا بند کردیں اور اس کی جگہ بھارت کہا کریں‘ ملک کا یہ نام ڈاکٹر امبیڈکر نے خوب سمجھ بوجھ کر دستور ہند میں لکھوایا تھا‘ ورنہ اب کوشش چل رہی ہے کہ اگر راجیہ سبھا میں بھی مناسب اعداد مل جائیں تو دستور میں ترمیم کر کے ملک کا نام ہندواستھان رکھ دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی شکایت کی کہ اپنے اور ہمارے حقوق کی بازیابی کے لئے مسلمان بڑی تعداد میں نکل کر سڑکوں پر کیوں نہیں آتے ہیں۔

حال میں عدلیہ میں کہا گیا کہ بابری مسجد انہدام کا معاملہ محض زمین کی لڑائی ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مقام افسوس وفکر ہے کہ ملک میں منفی ماحول کو بڑھاوا دینے کی کوششیں عدلیہ پر بھی اثرانداز ہوتی جارہی ہیں۔ دراصل 1949 سے قبل اس طرح کا کوئی جھگڑا تھا ہی نہیں جبکہ مسجد تو وہاں صدیوں سے قائم تھی اور وہاں باجماعت نماز پنجگانہ بھی ہوتی تھی۔ آر ایس ایس سربراہ کا غیر دستوری بیان کہ فوج کہتی ہے کہ اسے تیاری کرنے کے لئے 7 ماہ چاہئیں لیکن آر ایس ایس خود صرف تین دن کے اندر فوجی کارروائی کرسکتی ہے‘ ملک میں اندرونی سماجی نفرت کو بڑھاوا دیتا ہے اور ہمیں اس کے خلاف عدالتی کارروائی کرنی چاہئے۔ اترپردیش میں حالیہ چند ماہ میں ایک ہزار سے زائد انکاؤنٹر ہوچکے ہیں‘ اس طرف بھی عدالت کی توجہ دلائی جائے، دستور تہس نہس ہوتا ہوا دکھائی پڑ رہا ہے۔ پنجاب نیشنل بینک کے گھوٹالے سے تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ ملک کی موجودہ پالیسی دستور کے آرٹیکل 39(c) کی کھلی مخالفت کرنا یعنی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا کہ ملکی دولت کم سے کم ہاتھوں میں سمٹی رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کا ملک کے وسائل پر کوئی کنٹرول نہ رہے‘ اسی غرض سے قانون بنایا جارہا ہے کہ بینکوں کو اختیار ہوگا کہ جب چاہیں کھاتے دار کو اس کی جمع رقم دینے سے انکار کردیں اور اس کے بجائے جہاں چاہیں وہ رقم خرچ کر دیں۔ میٹنگ میں قوی اظہار تشویش کیا گیا کہ عوام کے محنت سے کمائے گئے پیسے کو ادارہ سازی کے ذریعہ لوٹ کر چند لوگوں کے ہاتھوں میں سونپا جارہا ہے۔ سیاسی جماعتوں سے دوٹوک گفتگو کی جائے کہ ان ایشوز کے مدنظر اگر وہ کھلے الفاظ میں اعلانات کرتے ہیں تبھی ہم ان کا ساتھ دیں گے۔ چھوٹی سیاسی پارٹیوں کو مسلمانوں کے ووٹ کاٹنے نہیں دیا جائے۔ ہمیں ملک بھر میں دستور بچاؤ مہم چلانی ہوگی، اس کو نام دیا جائے ’ہم بھارت کے لوگ‘۔ ہمیں مل کر مذہبی وثقافتی آزادی کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے ہمیں دیگر سیکولر جمہوری محاذوں سے مدد حاصل کر کے رائے عامہ بنانی ہوگی اور زمینی سطح پر کام کرنا ہوگا۔ ہمیں پہچاننا ہوگا کہ کون لوگ دستور کی برتری کو مانتے ہیں اور کون اس کو پامال کر رہے ہیں۔ شیڈیولڈ کاسٹ کی تعریف سے متعلق 1950 کے دستوری آرڈر کے پیرا 3 کو منسوخ کروانے کے لئے عدلیہ کا تو سہارا ہمیں لینا ہی ہوگا، ساتھ ہی عوام تک پہنچ کر انھیں اس سے متعلق آگاہ بھی کرنا ہوگا۔ یادر ہے کہ اس حکم کی رو سے کسی بھنگی‘ لوہار‘ نائی‘ درزی وغیرہ کو شیڈیولڈ کاسٹ کا ریزرویشن تبھی مل سکتا ہے اگر وہ ہندو‘ سکھ یا بودھ مذہب اختیار کرے‘ جبکہ یہ شرط لگانا دستور کی صریح خلاف ورزی ہے۔

شیڈیولڈ کاسٹ کے بہن بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھانے میں ہمیں خوشی محسوس ہونی چاہئے‘ ان کی شادیوں میں شرکت کرنا اور ان کے دکھ درد میں شامل ہونا چاہئے۔ میٹنگ میں راقم السطور نے عرض کیا کہ جسٹس سچر کمیٹی نے بتا دیا کہ باقی مذاہب کے ماننے والوں کے مقابلہ میں مسلمان سماجی‘ اقتصادی و تعلیمی میدانوں میں سب سے پیچھے اس لئے ہیں کہ ملک کی حکمرانی میں ان کی نمائندگی کا فقدان ہے۔ مرکزی وصوبائی ایوانوں اور مقامی نکایوں میں ان کی سیاسی نمائندگی کی کمی اس وجہ سے ہے کہ وہ انتخابی حلقے اور وارڈ جہاں مسلمانوں کی فیصد بہت زیادہ ہے وہ شیڈیولڈ کاسٹ کے لئے ریزرو ہیں جبکہ وہاں شیڈیولڈ کاسٹ کی فیصد قلیل ہے‘ حالانکہ ایسا کرنا قانون کے خلاف ہے لہٰذا شیڈیولڈ کاسٹ کے لوگوں کو مسلمانوں کی مدد کرنی ہوگی تاکہ 70 برس سے چلے آرہی مسلمانوں کی حق تلفی کے سلسلہ پر روک لگے۔ ساتھ ہی سچر کمیٹی نے بتایا کہ بارہویں جماعت تک اسکولوں میں کمزور طبقوں کے طلبا کی تعداد کا تناسب بھی کم ہوتا ہے اور کیونکہ ان کے گھروں پر زیادہ علمی ماحول نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ طلبا قابلیت میں بہتوں سے پیچھے بھی رہ جاتے ہیں۔ لیکن انڈر گریجویٹ سطح پر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لئے طلبا کے ذریعہ حاصل کئے گئے نمبروں کو سامنے رکھا جاتا ہے ورنہ ان کی قابلیت کو ایڈمشن ٹسٹ کے ذریعہ پرکھا جاتا ہے‘ جس میں کمزور طبقوں کے طلبا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ لہٰذا سچر کمیٹی نے سفارش کی کہ ملک میں انڈر گریجویٹ سطح پر داخلہ کے لئے امیدواروں کی قابلیت کو 60 فیصد فوقیت دی جائے اور باقی 40 فیصد میں یہ پرکھا جائے کہ امیدوار بیک ورڈ ہے کہ نہیں اور ہے تو کتنا‘ اس پرکھ کے لئے سچر کمیٹی نے 40 فیصد کو تین حصوں میں تقسیم کیا: جس ضلع سے امیدوار تعلق رکھتا ہے وہ کتنا پچھڑا ہوا ہے‘ امیدوار کا خاندانی پیشہ کتنا پچھڑا ہوا ہے اور امیدوار کی خاندانی آمدنی کتنی کم ہے۔ اس طرح 40+60 فیصد پرکھنے پر جو امیدوار فہرست میں اوپر آئیں انھیں داخلہ دیا جانا چاہئے۔ سچر کمیٹی کی یہ سفارش کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کے لئے نہیں ہے پھر بھی اس پر ملک میں نہ حکومت نے توجہ دی اور نہ ہی عوام نے، ضروری ہے کہ اس مدعے کو عوامی مدعا بنا کر اس کے نفاذ کے لئے کوشش کی جائے۔

مولانا محمود مدنی نے اپنے افتتاحیہ خطاب میں کہا تھا کہ اس پوری تگ ودو میں مسلمان صف اول میں نمایاں نہ رہیں تو بہتر ہے‘ اس پر کچھ لوگوں نے تشویش ظاہر کی کہ اس سے شائد غلط پیغام جائے گا کہ مسلمان تشدد کا شکار ہونے کے باوجود سامنے نہیں آرہے ہیں، جس سے ان پر بزدلی کا الزام لگ سکتا ہے۔ اس تجویز کی تشریح کرناٹک کے شوارودرمہاسوامی گالو نے صلح حدیبیہ کی روح کی مثال دے کر کہا کہ جب حضور اقدسؐ نے طے کیا کہ بجائے جنگ کے اہل قریش کو دل سے جیتا جائے۔ دراصل اس تجویز کو مسلمانوں کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اسے صرف ایک عارضی حکمت عملی مانا جائے‘ ورنہ مسلمان تو ’لاتخف‘ میں یقین رکھتا ہے‘ مسلمانوں کی طاقت کو نہ دنیا سمجھی ہے اور نہ ہمارا ملک۔ جوقوم روز پانچ دفعہ محلّہ محلّہ‘ ہفتہ میں ایک دفعہ بڑے گروپ میں اور سال میں دو دفعہ ہجوم بنا کر‘ پوری عمر جمع ہو کر مالک حقیقی کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے اور اس کے لئے وضو اور نماز کے ذریعہ اپنے کو جسمانی وروحانی طور پر تندرست وتوانا رکھتی ہو اس پر کون سبقت لے جا سکتا ہے‘ بس اقبال کو یاد رکھیں:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو پلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 01 Mar-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

عوامی نمائندوں کی بدعنوانی پر سپریم کورٹ کا شکنجہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سپریم کورٹ نے گزشتہ ماہ سنگ میل کی حیثیت رکھنے والے ایک اہم فیصلہ میں کہا کہ آزادی کے بعد پہلی پانچ دہائیوں کی بنیاد پر ملک کی جمہوری کارکردگی میں کچھ ناخوشگوار طرز عمل نظر میں آئے ہیں اور انتخابی عمل کی پاکیزگی کو قائم رکھنے کے لیے اشد ضروری ہے کہ ان خطا کاریوں سے تیزی کے ساتھ نمٹا جائے۔ منتخب عوامی نمائندوں کے پاس ان کے اعلان شدہ ذرائع آمدنی سے زائد مالیت کی دولت اور ساز وسامان کے جمع ہو جانے سے ملک میں قانون کے بجائے مافیا کی برتری کو فروغ ملے گا لہٰذا عدالت نے کسی ایم پی یا ایم ایل اے کے ذریعہ کیے جانے والے اس طرح کے جرم کو سزا کا موجب (Culpable) قرار دیا۔ لکھنؤ کی این جی او لوک پرہاری کے ذریعہ دائر کی گئی پی آئی ایل پر فیصلہ دیتے ہوئے جسٹس چلمیشور اور جسٹس نذیر کی بنچ نے کہا کہ ایسے جرم کرنے والے لوگ سبھی شائستہ حکومتوں کے دشمن ہیں اور انھیں قانون ساز ایوانوں کی رکنیت سے خارج کر دیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے حکومت کو قانون میں ضروری ردوبدل کرنا ہوگا تا کہ ناجائز طور پر دولت جمع کرنے والے عوامی نمائندوں کو ایوان کی رکنیت کے لیے نا اہل بنایا جا سکے۔ بنچ کے لیے عدالتی حکم نامہ تیار کرتے ہوئے جسٹس چلمیشور نے لکھا کہ اگر کسی رکن ایوان یا اس کے رشتہ داروں کے پاس ایسی جائداد پائی جائے جو ان کے اعلان شدہ ذرائع آمدنی سے زیادہ ہو تو صرف یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ اس عوامی نمائندہ نے اپنے دستوری عہدے کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ ایسی صورت حال کو کسی شریف سماج میں تسلیم نہیں کیا جانا چاہیے اور یہ دستور کے مطابق چلائی جا رہی کسی بھی حکومت کو زیب نہیں دیتا‘ ایسی حرکت جمہوری نظام کے تحت کسی عوامی عہدہ پر فائز شخص کے لیے واجب ضابطہ اخلاق سے موافقت نہیں رکھتی ہے۔

عدالت عظمیٰ نے حکومت کو یہ بھی ہدایت دی ہے کہ وہ ایک کل وقتی میکانزم (Permanent mechanism) قائم کرے، جس کے ذریعہ قانون ساز ایوان کے اراکین کی دولت کی بالیدگی پر نظر رکھی جائے تا کہ اگر ان کی دولت میں اضافہ ان کے اعلان شدہ ذرائع آمدنی کے تناسب سے تجاوز کر جائے تو ان کے خلاف ضروری قانونی کاروائی کی جا سکے۔ کسی بھی فرد کے پاس دولت کا ناجائز طور پر جمع ہونا سماج کی اخلاقی صحت کے لیے نقصان دہ ہے اور اگر قانون سازی کے ذمہ دار لوگ خود ہی اپنے عہدہ کا غلط استعمال کر کے اپنے پاس ناجائز دولت جمع کرنے لگیں تو یہ ایشو اور زیادہ فیصلہ کن ہو جاتا ہے۔ اس کام کے لیے ضروری ضوابط تشکیل دینے کے لیے عدالت نے حکومت کو اختیار دئے ہیں اور کل وقتی جو میکانزم قائم کیا جائے گا وہ وقتاً فوقتاً قانون ساز ایوانوں کے اراکین کے مالی حالات کا جائزہ لیتا رہے گا۔ عدالت نے صاف کر دیا کہ اس ضمن میں اگر کوئی امیدوار صحیح اور مکمل اطلاع فراہم نہیں کرتا ہے تو اس قلم اندازی کو بدعنوانی ہی مانا جائے گا جو عوامی نمائندگی قانون (Representation of the People Act) کے تحت نا معقول اثر رسوخ (Undue influence) کے زمرہ میں آتی ہے اور جس کی بنیاد پر مجرم کے الیکشن کو رد کیا جا سکتا ہے۔ عدالت کا کہنا ہے کہ اس طور پر ووٹروں کے پاس مناسب اطلاع رہے گی، جس کی بنیاد پر وہ طے کر سکتے ہیں کہ کسے ووٹ دیں۔ عدالت نے اظہار افسوس کیا کہ بدقسمتی سے اب تک پارلیمنٹ اور الیکشن کمیشن نے اس سمت میں ضروری کاروائی نہیں کی۔ جج صاحبان نے کہا کہ ملک میں ایسی زمین جائداد اور کالے دھن میں بدنما اضافہ ہوتا جا رہا ہے، جن کا استعمال برسہا برس کسی کی بھی فلاح و بہبود کے لیے نہیں ہوتا ہے اور اسی طرح کی دیگر مالی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس کی بڑی وجہ بھی اراکین ایوان کے ذریعہ خود بڑے بڑے ٹھیکے ہتھیا لینا ہے۔ عدالت نے کہا کہ ہمارے ملک میں عوامی نمائندوں کے پاس لوگ جاتے ہیں تا کہ وہ ان کی پریشانیاں رفع کروا سکیں لیکن دراصل یہ لوگ ہی عوام کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔

”ہمارے ملک کی عدالت عظمیٰ ایسی اعلیٰ مثال قائم کر رہی ہے، جس سے حکمرانی کا معیار اونچا ہو سکے گا تو ہم سب کو ایک آواز میں ایسے فیصلہ کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ جسٹس چلمیشور اور ان کے تین دیگر ساتھی قابل جج صاحبان نے حال میں پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں ان کی تنقید کریں کہ سماج میں خرابیوں پر انھوں نے روک کیوں نہیں لگائی۔ یہ فریضہ صرف ان جج صاحبان کا ہی نہیں ہے بلکہ ہم سب کا ہے۔“

عدالت نے زور دیا کہ جمہوریت میں عوام ہی حاکمیت کا بنیادی مخزن (Ultimate repository of sovereignty) ہوتے ہیں، اس لیے ان کا حق ہے کہ حاکمیت کی آلہ کاری سے متعلق موجودہ یا اس کے خواہشمند افراد کی تفصیلی اطلاع عوام تک پہنچائی جائے تا کہ وہ حکومت کی کارکردگی کی تنقیدی جانچ کر سکیں۔ اس کے علاوہ نیشنل الیکشن واچ نے اپنی ویب سائٹ پر تفصیل ڈال رکھی ہے کہ لوک سبھا کے موجودہ ممبروں میں سے 34 فیصد ممبروں نے پرچہ نامزدگی دائر کرتے وقت خود لکھا تھا کہ ان کے خلاف فوجداری کے مقدمے چل رہے ہیں۔ کم وبیش یہی حالات صوبائی اسمبلیوں اور میونسپل کارپوریشنوں کے ہیں۔ سپریم کورٹ نے صریح حکم صادر کیا ہے کہ عوامی نمائندگی قانون کے تحت متعلقہ رول 4A اور فارم 26 میں ترمیم کر دی جائے تا کہ امیدواروں اور ان کے رشتہ داروں کا فرض بن جائے کہ وہ اپنے ذرائع آمدنی کا پورا بیورہ دیں۔ حق اطلاع قانون کے تحت زیڈ الیف آئی نے الیکشن کمیشن سے پوچھا ہے کہ 16 فروری کے آرڈر کے بعد سے اس نے اب تک رول 4 اور فارم 26 میں کیا ترمیم کی حالانکہ اس کی ویب سائٹ پر ابھی تک اس تعلق سے کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی ہے۔ یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ 16 فروری کے بعد سے اب تک کون سے الیکشن کے لیے نامزدگی کا سلسلہ شروع ہوا ہے جہاں یہ ترمیم شدہ رول اور فارم استعمال نہیں ہوئے۔ اس ترمیم کا اثر یقیناً مستقبل قریب میں ہونے والے اسمبلی انتخابوں پر پڑے گا، جن میں اگلا نمبر کرناٹک کا ہے۔ یاد رہے کہ اس مدعے پر مارچ 2016 میں سیاسی جماعتوں سے رائے مانگی گئی تھی، اس وقت بیشتر نمائندوں نے پرچہ نامزدگی دائر کرتے وقت امیدوار کے ذرائع آمدنی بتانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ایک سابق چیف الیکشن کمشنر کا کہنا ہے کہ بہت سے امیدواروں کی دولت میں ہر پانچ برس میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے، جس کا جواز نظر نہیں آتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کئی امیدوار پیشہ کے کالم میں لکھتے ہیں ’سماجی کارکردگی‘ جبکہ یہ نہیں بتاتے کہ ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

موجودہ دنیا میں سرکاری لین دین میں شفافیت کے معیار گھٹتے جا رہے ہیں جیسے کہ ڈونلڈ ٹرمپ پر الزام ہے کہ انھوں نے الیکشن جیتنے کے لیے ایک طرف روس کی خفیہ ایجنسیوں کا سہارا لیا اور دوسری طرف سستی شہرت کے لیے اندرون و بیرون امریکہ سماجی ہم آہنگی کو داؤ پر لگا دیا اور حال میں انھوں نے بدعنوانی کو بڑھاوا دینے والے ایک ضابطہ کو منظوری دے دی، جس کی رو سے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ تیل‘ گیس اور کان کنی (Mining) کی کمپنیاں بتائیں کہ انھوں نے دیگر ممالک میں کس کو کتنی ادائیگی کی ہے۔ اس پس منظر میں ہمارے ملک کی عدالت عظمیٰ ایسی اعلیٰ مثال قائم کر رہی ہے، جس سے حکمرانی کا معیار اونچا ہو سکے گا تو ہم سب کو ایک آواز میں ایسے فیصلہ کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ جسٹس چلمیشور اور ان کے تین دیگر ساتھی قابل جج صاحبان نے حال میں پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ آنے والی نسلیں ان کی تنقید کریں کہ سماج میں خرابیوں پر انھوں نے روک کیوں نہیں لگائی۔ یہ فریضہ صرف ان جج صاحبان کا ہی نہیں ہے بلکہ ہم سب کا ہے۔ تعریف کے لائق ہیں ایڈورڈ اسنوڈن اور جولین اسینج جو وائکی لیکس (Wikileaks) مواد کو منظر عام پر لے آئے کہ کس طرح حکومت امریکہ نے اپنے ہی باشندوں پر نگاہ رکھنے کے لیے کڑی نگرانی کا لق و دق پروگرام بنایا تھا۔ بعد میں ان دو اشخاص جیسے لوگوں کے تحفظ کے لیے امریکہ میں قانون (Whistleblower Protection Enhancement Act) 2012 بنایا گیا۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے 2013 میں کتاب شائع کی تا کہ تمام ممالک اس سے استفادہ کر کے نئے قوانین بنائیں، جس سے افراد اگر سماجی خرابیوں کو اجاگر کریں تو ان پر کوئی آنچ نہ آئے۔ اقوام متحدہ کے بدعنوانی کے خلاف کنونشن کی شق 33 میں بھی اسی طرح کے قانون بنانے کے لیے تمام ممالک سے کہا گیا ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 08 Mar-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

وزیراعظم کا سفید پرچم بنام ملی سبزہ کی ہمواری

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

شاہ اردن کی ہند آمد کے موقع پر نئی دہلی کے وگیان بھون میں مسلمانوں کی موجودگی میں وزیراعظم نریندر مودی کی تقریر سے بظاہر لگتا ہے گویا ملت کے تئیں ان کے موقف میں تبدیلی آئی ہو۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ سرزمین ہند میں متعدد مذاہب پھلے پھولے ہیں، جس کی وجہ سے ہر ذرّہ میں قدرت الٰہی نظر آتی ہے اور اسی لیے ’ہمارا پیغام امن و آشتی عالمی گہواروں میں گونجا ہے‘۔ انھوں نے دہلی کے صوفیائے کرام سے اظہار عقیدت کیا اور خوشی ظاہر کی کہ دہلی کا نام اردو لفظ گنگا جمنی دوآبے کی ’دہلیز‘ سے نکلا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی کشادہ دلی کا سہرا یہاں کے سماجی و ثقافتی تنوع کو جاتا ہے اور اسی سے ہمارے قومی فخر کی میراث بنی ہے۔ وزیراعظم نے ہولی کی رنگینی کو آنے والے گڈ فرائڈے، بدھ جینتی اور ماہ رمضان سے جوڑا، عیدالفطر کے پیغام محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی جمہوریت دراصل اسی قدیم مذہبی جمعیت کا جشن ہے۔ عمان اسلامی اعلامیہ اور اردن کے ولی عہد غازی بن محمد کی کتاب ’غور وفکر کرنے والے انسان کے لیے اسلام فہمی کی گائیڈ‘ کی تعریف کرتے ہوئے نریندر مودی نے نیک خواہشات کا اظہار کیا کہ ہندوستانی مسلم نوجوان کے ایک ہاتھ میں قرآن کریم ہو، جس سے اسے اعلیٰ اخلاقیات کا سبق ملتا رہے اور دوسرے ہاتھ میں کمپیوٹر ہو جس کے ذریعہ اس کے لیے سائنس اور ترقی کی راہیں ہموار ہوتی رہیں۔ وگیان بھون میں پیش کردہ مودی کے تصورات کی خوشبو اور زبان کی مٹھاس ہندوستانی مسلمانوں کے شعور کو فوری طور پر لمحاتی سکون ضرور بخشتی ہے لیکن اگلے ہی لمحہ ملت اس عارضی غنودگی سے بیدار ہوکر حال کا ماضی سے مطابقاتی تجزیہ کر تے ہوئے مستقبل کی تصویر سے متعلق ذہنی تذبذب کا شکار ہونے لگتی ہے۔

پھر بھی ہندوستانی مسلمان خواہش رکھتا ہے کہ اس کے خدشات بے بنیاد ثابت ہوں اور یہ کہ نریندر مودی کے دل میں واقعی تبدیلی آئی ہو۔ اس صورت حال میں وہ چاہتا ہے کہ وزیراعظم کا یہ خطاب زمینی سطح کے مندرجہ ذیل اقدامات پر آشکارا ہو:(i) جو ٹی وی چینل ایسے مباحثہ و دیگر پروگرام کرتے ہیں جن سے ہندوستان میں فرقہ وارانہ نفرت کو فروغ ملتا ہے، ان کی مذمت کرکے انھیں موردالزام ٹھہرا کے سزا دی جائے۔(ii) 2014 سے اب تک کے لنچنگ کے سبھی معاملات میں ملزموں کے خلاف کارروائی کی رپورٹ شائع کی جائے۔(iii) یوپی میں مدرسوں کو پریشان کرنا اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرنا بند کیا جائے۔(iv) محبت کرنے والے جوڑوں پر این آئی اے کو مسلط نہ کیا جائے۔(v) لو جہاد اور گھر واپسی جیسی اصطلاحات اقلیتوں کی توہین کرنے کے لیے ایجاد کی گئی ہیں، انھیں علانیہ طور پر رد کیا جائے۔(vi) آزادی سے اب تک ملک میں سبھی مذاہب کے ماننے والی خواتین کے خلاف جو مظالم ہوئے ہیں جیسے جہیز کے لیے جلا دینا، قتل کردینا اور ایک وقت میں تین طلاق دینا، ان کے اعداد و شمار شائع کیے جائیں۔ اس بنیاد پر برائیوں کی روک تھام کے لیے ضروری قانون بنائے جائیں۔(vii) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کو تسلیم کیا جائے اور اس کی بیجا مخالفت ختم کی جائے۔(viii) حکومت کے ذریعہ آر ایس ایس، اس سے جڑی ہوئی تنظیموں اور اسی طرح کی دیگر تنظیموں سے دستور کے مطابق دوری رکھی جائے اور ان کے ذریعہ اقلیت مخالف بیان بازی اور دھمکی آمیز طرز و انداز کی علانیہ طور پر مذمت کی جائے اور ان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔(ix) کوئی بھی عبادت ملک کے ہر شہری پر زبردستی عائد و نافذ نہ کیا جائے۔(x) یوگا اور نماز دونوں ہی کا اثر ہوتا ہے روح کی بالیدگی اور جسم کو مضبوطی و تازگی دینا، دونوں کی برابر سے اور ایک ساتھ حوصلہ افزائی کی جائے۔

(xi) آئینی سیکولرزم کو علانیہ طور پر قبول کیا جائے، اسے گلے لگایا جائے اور آغوش میں لیا جائے، اس دستوری پاکیزگی کی توہین کرنا بند کیا جائے۔(xii) ایسے نوجوان جو دہشت گردی کے الزام میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیے جاتے ہیں اور بعد میں عدالت فیصلہ دیتی ہے کہ وہ معصوم تھے انھیں ہرجانہ ادا کیا جائے اور جن لوگوں نے ان کے خلاف بیجا الزام لگائے انھیں سزا دی جائے۔(xiii) فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے جو لوگ بے گھر ہوگئے ہیں انھیں ان کے گھر واپس پہنچایا جائے، ان کی زراعت کی زمین اور ان کا روزگار انھیں واپس دلوایا جائے۔(xiv) وقف جائداد (ناجائز طور پر قابض لوگوں کی بے دخلی) بل 2014 پر 2015 میں جو اسٹینڈنگ کمیٹی تشکیل دی گئی، اس میں 30 میں سے صرف 7 ممبر مسلمان تھے۔ کمیٹی کے ذریعہ دی گئی رپورٹ جلد بازی میں تیار کی گئی ہے، اس میں کیے گئے دعوے غیر مستند ہیں، اس میں وزارت کے مضبوط ترین دلائل پر مبنی اعتراضات کو بغیر وجہ بتائے خارج کردیا گیا۔ اس لیے اسٹینڈنگ کمیٹی کی ازسر نو تشکیل کی جائے جس میں کم از کم تین چوتھائی اراکین مسلمان ہوں۔ 2014 کے اصل بل کی دفعات کی روشنی میں اسٹینڈنگ کمیٹی کی سفارشوں پر نظر ثانی کی جائے اور 2014 کے بل کو بحال کیا جائے۔(xv) جو وقف املاک محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہیں، ان سے متعلق اس محکمہ اور مرکزی وقف کونسل کے مشترکہ میکانزم کو تازہ دم کر کے دوبارہ شروع کیا جائے، اس کی سہ ماہی میٹنگوں کو پھر سے شروع کیا جائے اور ان میٹنگوں میں پاس کی گئی قراردادوں پر عمل کو یقینی بنایا جائے۔(xvi) جو وقف املاک حکومت یا اس کی کسی ایجنسی کے قبضہ میں ہیں، انھیں خالی کر کے وقف بورڈ کو ان کی سپردگی کی جائے۔(xvii) حج سبسڈی اور ہندوستان و سعودی عرب کے درمیان حج کے سمندری سفر پر ایک وہائٹ پیپر شائع کیا جائے، جس سے ان دونوں ایشوز سے متعلق حقائق سامنے آجائیں گے اور غلط فہمیاں رفع ہوسکیں گی اور اس سے حکومت اور ملت اسلامیہ ہند گائڈ ہوسکیں گے۔

(xviii) مدرسہ سے تعلیم یافتہ طلبا کے داخلہ کو آسان بنانے کے لیے سبھی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں برج کورسز چلائے جائیں، جیسا کہ فی الحال صرف چار یونیورسٹیوں میں ہورہا ہے۔(xix) یونیورسٹیوں اور کالجوں میں انڈر گریجویٹ سطح میں داخلہ کے لیے ملک میں متبادل داخلی پیمانہ (Alternate Admission Criteria) کا نفاذ کیا جائے جیسا کہ سچر کمیٹی نے سفارش کی تھی۔(xx) ریزرو بینک آف انڈیا نے بینکوں میں بے سود بینکنگ کے لیے مخصوص کھڑکیاں کھولنے کے لیے جو سفارش کی تھی، اسے منظوری دی جائے۔(xxi) پارلیمنٹ و اسمبلیوں کے جن انتخابی حلقوں میں شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی سب سے زیادہ فیصد میں ہے، انھیں کو ریزرو کیا جائے جیسا کہ قانون میں لکھا ہے، نہ کہ ان کو جہاں شیڈولڈ کاسٹ کا فیصد کم ہے۔(xxii) کانسٹی ٹیوشن شیڈولڈ کاسٹ آرڈر 1950 کے پیرا 3 کو خارج کر کے شیڈولڈ کاسٹ کی تعریف کو مذہب کی غیر آئینی قید سے آزاد کیا جائے، جیسا کہ جسٹس مشرا کمیشن نے سفارش کی تھی۔(xxiii) یوپی ایس سی اور سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کے لیے تعینات و دیگر تمام مرکزی و صوبائی انٹرویو پینلوں میں کم از کم ایک اقلیتی رکن کو یقینی بنایا جائے۔(xxiv) کشمیر و آسام اور ملک کے سبھی ان اضلاع میں جہاں مسلمان بہت بڑی فیصد میں ہیں، وہاں ناخواندہ بچوں کی تعلیم اور بے روزگار نوجوانوں کے روزگار کے لیے مثبت اقدامات کیے جائیں، تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے عوام اور حکومت کو مل کے مشترکہ کارروائی کرنے کے لیے اسکیم بنائی جائے اور پرائیویٹ تعلیمی پروجیکٹس میں سرکاری امداد دی جائے، وہاں تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے زمین کے ضروری رقبہ میں کمی کردی جائے، سرکاری ملازمتوں کے اشتہار ان علاقوں میں مقامی زبان میں شائع کروائے جائیں اور اسپیشل بھرتیوں سے قبل وہاں ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں کے ذریعہ کیمپ لگائے جائیں۔ وگیان بھون میں یکم مارچ 2018 کو وزیراعظم کے پیغام کی سنجیدگی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اگر یہ اقدامات کیے جائیں گے تو مسلمان ان کی طرف راغب ہوسکتے ہیں، کیونکہ ملت اپنے کو کہیں گروی نہیں رکھتی ہے۔

□❖□

”وگیان بھون میں پیش کردہ مودی کے تصورات کی خوشبو اور زبان کی مٹھاس ہندوستانی مسلمانوں کے شعور کو فوری طور پر لمحاتی سکون ضرور بخشتی ہے لیکن اگلے ہی لمحہ ملت اس عارضی غنودگی سے بیدار ہوکر حال کا ماضی سے مطابقاتی تجزیہ کرتے ہوئے مستقبل کی تصویر سے متعلق ذہنی تذبذب کا شکار ہونے لگتی ہے۔“

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 15 Mar-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

ملی حکمت عملی ورضاکارانہ جدوجہد کی اہمیت

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”سبھی ووٹروں سے یہ بھی اپیل کرنی ہے کہ وہ الیکشن میں ووٹ ضرور ڈالیں، ووٹنگ کے دن کو اپنی مصروفیات میں نمایاں مقام دیں، یہ احساس ہونا چاہیے کہ ووٹ دینا میرا ذاتی، دستوری، ملی و دینی فریضہ ہے، اس فرض کی ادائیگی سے ملت کا مفاد وابستہ ہے۔اس کام کے لیے ہر وارڈ اور ہر انتخابی حلقہ میں سمجھدار و بے لوث افراد کو رضاکارانہ طور پر بڑھ کے آگے آنا چاہیے۔“

لکھنؤ میں گزشتہ اتوار کو ملک کے مختلف حصوں سے جمع ہوئے دانشوروں و سرگرم کارکنوں نے ملی مفاد کے مدنظر طویل مدتی، وسط مدتی اور قلیل مدتی حکمت عملی پر غور وخوض کیا اور اپیل کرنے کا فیصلہ کیا کہ اپنے کو ووٹر کے طور پر رجسٹر کروانے میں ہر اس مرد وعورت کو فوری طور پر لگ جانا چاہیے جس کا ووٹر لسٹ میں رجسٹریشن نہیں ہے۔ہم کوشش کریں کہ ہم میں سے کوئی بھی نہ بچے جس کی عمر 2019 میں ووٹ دینے کی ہو اور اس نے اپنا رجسٹریشن الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ پر نہ کروایا ہو اور ساتھ ہی اپنا آدھار کارڈ بھی ضرور بنوائیں۔اہل فکر خواتین و حضرات کو آگے بڑھ کے اپنے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور جان پہچان والوں سے دریافت کر لینا چاہیے کہ وہ ووٹر کے طور پر رجسٹرڈ ہیں کہ نہیں اور ان کا آدھار کارڈ بن گیا کہ نہیں، اگر نہیں تو ان کی مدد کر کے انھیں ووٹر کی حیثیت سے رجسٹر کروا دیں اور ان کا آدھار کارڈ بھی بنوا دیں۔سبھی ووٹروں سے یہ بھی اپیل کرنی ہے کہ وہ الیکشن میں ووٹ ضرور ڈالیں، ووٹنگ کے دن کو اپنی مصروفیات میں نمایاں مقام دیں، سارے گھر میں اس دن جشن کا ماحول ہونا چاہیے، یہ احساس ہونا چاہیے کہ ووٹ دینا میرا ذاتی، دستوری، ملی و دینی فریضہ ہے، اس فرض کی ادائیگی سے ملت کا مفاد وابستہ ہے۔اس کام کے لیے ہر وارڈ اور ہر انتخابی حلقہ میں سمجھدار و بے لوث افراد کو رضاکارانہ طور پر بڑھ کے آگے آنا چاہیے جو زمینی سطح پر لوگوں سے رابطہ قائم کر کے یہ سب کام کروائیں۔ ان لوگوں کو کام سمجھانے کے لیے مختلف علاقوں میں ورکشاپ کا انعقاد کیا جائے۔ جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی ہند، جمعیت اہل حدیث کی طرح کی ملک کی بڑی تنظیموں کے دفتر تقریباً ہر جگہ واقع ہیں، ان سے اپیل کی گئی کہ وہ اس طرح کے اشخاص کی شناخت کرنے اور ورکشاپ منعقد کرنے میں تعاون کریں، ان میں سے بیشتر تنظیمیں یہ کام کرنے کے لیے بخوشی راضی ہیں۔مساجد کے ائمہ و مسجد کمیٹیوں سے بھی اپیل کی گئی کہ نمازیوں میں سے ایسے کارآمد اشخاص کی شناخت کرنے میں مدد کریں۔

ساتھ ہی یہ ایشو بھی زیر غور آیا کہ طویل مدتی حکمت عملی کے مطابق تو ضروری ہے کہ ملت کی اپنی سیاسی جماعت ہو اور کیرالہ کے ماڈل پر وہ حکمرانی میں اپنی حصہ داری کے حق کو بارآور کروائے، لیکن کیونکہ 2019 کے الیکشن میں اب وقت کم رہ گیا ہے اور فی الحال غیر سماجی عناصر مسلم دشمنی کو ہی اپنا منشور بنائے ہوئے ہیں، بلکہ خطرہ لاحق ہے کہ 2019 کا الیکشن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں منفی فاصل آب (Negative watershed) نہ بن جائے، اس لیے وہ مسلم جماعتیں جو عموماً الیکشن میں اپنا امیدوار کھڑا کرتی ہیں، لیکن انھیں قلیل ووٹ ملنے کی وجہ سے ناکامی ہوتی ہے پھر بھی ان کی وجہ سے مسلمانوں کے ووٹ تقسیم ہو جاتے ہیں، لہٰذا ملت الیکشن کے نتیجوں میں اپنا مثبت مقام پیدا نہیں کر پاتی ہے، ایسی سیاسی جماعتوں سے اپیل کی جائے کہ 2019 کے الیکشن میں اپنا امیدوار کھڑا نہ کریں۔ بیشک وہ بیان جاری کریں کہ ان کی پارٹی وجود میں ہے، لیکن وقت کی ضرورت کے مدنظر ملی مفاد میں وہ اپنا امیدوار 2019 کے الیکشن میں کھڑا نہیں کر رہی ہیں۔فوری طور پر مثالیں موجود ہیں، کرناٹک میں ایک مسلم خاتون سیاستداں علانیہ طور پر سیکڑوں کروڑ روپے خرچ کر رہی ہیں، اپنے امیدواروں پر جن کا اثر صرف ملت کے ووٹوں کو تقسیم کرنا ہی ہے، تا کہ ملی مفاد کو نقصان پہنچے۔ان خاتون کو بھی ہمیں یکجا ہو کر سمجھانا چاہیے کہ دنیا میں اپنے وجود کے عظیم مقصد پر توجہ دیں اور ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھیں۔ کرناٹک اور ہندوستان کے ملی رہنماؤں کو اس طرح کی شخصیات پر اخلاقی اثر ڈالنے کی مستقل کوشش کرنی چاہیے۔یوپی اور بہار کی تین پارلیمانی سیٹوں پر وسط مدتی انتخابوں کے نتائج سے بھی سبق لینا چاہیے کہ اگر غیر فرقہ وارانہ طاقتیں مل جائیں اور ان کی جیت میں ذاتی مفاد والے افراد نہ آئیں اور ملت سمجھداری کے ساتھ ووٹ دے تو انجام مثبت ہو سکتا ہے۔

جمعہ کے خطبہ کے اختتام پر سورہ النحل کی آیت 90 سال میں 52 دفعہ پڑھی جاتی ہے، سارے دستور حیات کا ایک جامع و مکمل خاکہ اس آیت کے اندر آ گیا ہے، ہمیں عدل کا اور حسن سلوک کا اور اہل قرابت کو دیتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے، کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم و سرکشی کی ممانعت کی گئی ہے۔لہٰذا جو لوگ اپنے ذاتی مفاد میں الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں اور اس کا اثر صرف یہ ہوتا ہے کہ ملت کے ووٹ تقسیم ہو جاتے ہیں اور اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اس آیت کی رو سے ان لوگوں کی سخت گرفت ہونی ہے۔یہی پکڑ ملت کے ان افراد کی ہونی ہے جو ٹی وی پر مباحثوں میں جا کر حق کی بات نہیں کرتے، بلکہ وہ شاطر اینکر کی بدسلوکی کا شکار بنے رہتے ہیں اور پورے مباحثہ کا کل اثر اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ٹی وی پر آ کر اس طرح بدنامی کروانے کے لیے ان اشخاص کو رقم ملتی ہے تو انھیں ہم سب نے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔پھر یہ طے ہوا کہ اکابرین ملت اتفاق رائے سے ایک پینل تشکیل دیں اور ٹی وی کے منتظمین سے کہا جائے کہ جب کبھی ملت کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے کسی نمائندہ کی ضرورت ہو تو اس پینل میں سے کسی کو بھی بلا لیا جائے۔ چوتھا فیصلہ یہ کیا گیا کہ ملت کو صحیح اطلاعات پہنچانے کے لیے، ان کو صحیح رائے دینے کے لیے، ضرورت پڑنے پر انھیں بروقت متنبہ کرنے کے لیے ڈیجیٹل پلیٹ فارم (Digital platform) بنایا جائے جس میں ڈالے جانے والے مواد کی پہلے سے ہی جانچ پڑتال کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے اور اس پلیٹ فارم پر کڑی نظر رکھی جائے، تا کہ اس کا غلط استعمال نہ ہو بلکہ سو فیصد ملت کے حق میں ہی اسے کام میں لایا جائے۔ پانچواں فیصلہ ہوا کہ بردبار اشخاص پر مشتمل ایک گروپ اس کام پر مامور کیا جائے کہ وہ غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کے لیڈروں سے گفتگو کر کے انھیں قائل کرے کہ مسلمانوں کے خلاف ناانصافیوں کو ختم کروانا اور ان کے حقوق کی بازیابی کے لیے مثبت کارروائی کرنا ان کی ترجیحات میں ہونا چاہیے۔ایک آخری تجویز یہ بھی سامنے آئی کہ 2019 کے انتخابات کے تعلق سے مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی میں تو کوئی کمی نہیں رکھنی چاہیے، لیکن ملت کے کار منصبی کو عوامی طور پر بہت نمایاں نہیں کرنا چاہیے۔

ادھر دو روز قبل زکوٰۃ ہاؤس بہرائچ میں معزز خواتین و حضرات نے مثال قائم کی ایک ساتھ بیٹھ کر رضاکارانہ پیشکش کے ذریعہ، مہیلا کالج کی سابق پرنسپل شہناز صدیقی نے غریب لڑکیوں کے لیے سلائی کڑھائی مرکز قائم کر کے اس کی دیکھ بھال کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا، حنا اور ہبہ ان کی مدد کریں گی، ڈاکٹر اے آر خان اور ڈاکٹر مجیب انصاری نے مرسی ہوم نام کا رفاہی شفا خانہ قائم کر کے اس کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی۔ نظام الدین و مشرف علی صدیقی نے زکوٰۃ ہاؤس کے کمپیوٹروں اور کلاس روم کا استعمال کر کے ملت کے ضرورت مند طلبا کی کمپیوٹر ٹریننگ شروع کروانے کی ذمہ داری لے لی، ان کی مدد کرنے کے لیے فاروق اعظم بخوشی راضی ہو گئے ہیں۔یہ گروپ نویں اور گیارہویں درجہ میں داخلہ کے لیے کوچنگ بھی کروائے گا اور جو بچے بیچ میں پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں، ان پر بھی توجہ دے گا، ظفر اسلام بچوں کو بجلی کا کام سکھانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، محمد ایاز عورتوں اور مردوں کے لیے قرآن فہمی کے ہفتہ وار اجتماع کو فروغ دیں گے۔ بھلا ہو مولانا خالد رشید فرنگی محلی کا وہ زیڈ ایف آئی کے یپی ہوم یتیم خانہ کے بچوں کو لکھنؤ کے سفر کے دوران مکمل میزبانی کرنے پر بیحد خوش ہیں۔اس ماڈل کی تقلید دیگر اضلاع میں بھی کی جا سکتی ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 22 Mar-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

ملکی اقتصادی حالات میں سدھار کا نسخہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”یہ بھی ایشو باعث تشویش ہے کہ 2014 سے اب تک 23,000 کروڑ پتی افراد ہندوستان سے باہر جا چکے ہیں، یہ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ملک میں کل کروڑ پتیوں کی تعداد کے تناسب کے اعتبار سے یہ انخلا (Exodus) دنیا میں سب سے زیادہ ہے، جبکہ ملک میں زیادہ سرمایہ کاری اندرون ملک ہی ہونی چاہیے۔“

رُچِر شرما تجارتی مارکیٹ کے عالمی ماہر (Market strategist) ہونے کے ساتھ مشہور بین الاقوامی کمپنی مورگن اسٹینلے انویسٹمنٹ مینجمنٹ کے ہیڈ بھی ہیں، مختلف ممالک میں ان کے 600 دفتر ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اہم کانفرنسز میں مدعو کیے جاتے ہیں، تاکہ اقتصادی رجحانوں کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور بتائیں کہ پالیسی میں کہاں کیا کمی ہے جس میں تبدیلی کر کے عوام کی فلاح کے لیے بہتری لائی جاسکتی ہے۔ دو روز قبل ایک مشہور ٹی وی چینل کے ذریعہ منعقد اقتصادی چوٹی کانفرنس میں، جس میں وزیراعظم نریندر مودی نے بھی خطاب کیا، رچر شرما بھی شامل ہوئے اور بعد میں ٹی وی پر ان کا انٹرویو نشر ہوا، جس میں انھوں نے کہا کہ گزشتہ 25 برس سے وہ ہندوستان کے اقتصادی حالات پر مستقل گہری نظر رکھے ہوئے ہیں، دو برس قبل تک میڈیا کے مطابق ملک میں بڑا پراُمید ماحول تھا کہ جلد ہی قومی اقتصادی بالیدگی (National Economic Growth) بڑھ کر 10-8 فیصد ہو جائے گی، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ حالانکہ اب عالمی معاشیات سازگار ہیں لیکن گزشتہ 18 ماہ کی اس وسیع حیات تازہ (Global Economic Revival) میں ہندوستان کچھ خاص اشتراک نہیں کرسکا۔ اس کی صریح وجوہ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کا ناقص نفاذ ہیں، ساتھ ہی حال کے برسوں میں ہندوستان میں بینکوں کے نظام میں ڈھیلا پن بھی اس منفی صورت حال کے لیے قصوروار ہے۔

ہندوستان میں دو تہائی اثاثہ ان بینکوں کے پاس رہتا ہے جو حکومت کے زیر نگرانی ہیں اور یہ تناسب جمہوری ممالک میں نقصاندہ حد تک زیادہ اور بے جوڑ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب عموماً ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوتا ہے، وہ بھی اس وجہ سے کہ سماجی ہدف کے حصول کے لیے اتنی مقدار ہر ملک کے لیے ضروری ہے، لیکن ہندوستان جیسا کوئی بھی ملک نہیں ہے جہاں یہ تناسب اس قدر بے توازن و ناہموار ہو۔ اگر نفع بخش اضافہ پذیر مالی سرگرمی کو زیر غور لایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے متعلق زیادہ تر کارروائی پرائیویٹ سیکٹر کے بینکوں کے ذریعہ ہو رہی ہے، مثلاً تجارتی سرمایہ کاری، کریڈٹ و ڈیبٹ کارڈ، آن لائن پیمنٹ اور بڑی خردہ تجارت کی قیادت۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بینکنگ سیکٹر پھر بھی بے خبری و غفلت کی وجہ سے پرائیویٹ ہاتھوں کی طرف گامزن ہے، لیکن ملک کو اس پراگندگی کا خمیازہ بھگتنا پڑسکتا ہے۔ ادھر پبلک سیکٹر کے بینکوں کے وصف میں کمی آرہی ہے اور ملک کی اقتصادی صحت یابی خرابی کا باعث بنتی جا رہی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ بینکنگ سسٹم میں اصلاحات کر کے سمجھی بوجھی پالیسی کے تحت سرکاری سیکٹر کی معقول حصہ داری پرائیویٹ سیکٹر میں منتقل کی جائے، سرکار کے زیر نگرانی بینکوں میں بھی قرض دیتے وقت بیجا سختی سے پرہیز کرنا ہوگا، غیر ضروری انضباطی تجاوز (Regulatory overkill) سے گریز کرنا ہوگا، تاکہ وہاں قرض دینے کی کارروائی ماند نہ پڑجائے۔ یاد رکھئے کہ پرائیویٹ بینک پھر بھی قرض دینا جاری رکھیں گے، لیکن وہ بڑی کمپنیوں کی جانب زیادہ توجہ دیتے ہیں اور یہ بڑی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں مالدار لوگ اور زیادہ مالدار ہوتے جارہے ہیں، بڑی کمپنیاں چھوٹی کمپنیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں۔ یہ بھی ایشو باعث تشویش ہے کہ 2014 سے اب تک 23,000 کروڑ پتی افراد ہندوستان سے باہر جا چکے ہیں، یہ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ملک میں کل کروڑ پتیوں کی تعداد کے تناسب کے اعتبار سے یہ انخلا (Exodus) دنیا میں سب سے زیادہ ہے، جبکہ ملک میں زیادہ سرمایہ کاری اندرون ملک ہی ہونی چاہیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج سرمایہ کاری کے لیے سب سے زیادہ چاہے جانے والی جگہیں ہیں دبئی، سنگاپور، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ۔ ہمیں ان اقدامات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، جس سے ہمارا ملک اقتصادی میدان میں اگلا چین بن سکے۔ طریقہ حکمرانی میں چین سے مختلف ہونے کے باوجود ہمیں ایسی ترکیبیں کرنی ہوں گی کہ ہم اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔ وہاں شخصی فرماں روائی ہے لیکن ہماری جمہوریت میں سیاست کی اہمیت بیجا طور پر بہت زیادہ ہے۔ ہماری سمجھداری اس میں ہوگی کہ الیکشن کے نتائج کا اثر ملک کی اقتصادی صورت حال پر بالکل بھی نہیں پڑنا چاہیے، سیاسی ردوبدل کے باوجود ملک کا معاشی مدار اپنی ڈھری پر چلتے رہنا ہی نہیں، بلکہ ترقی پذیر رہنا چاہیے۔ دنیا کے ممالک میں مختلف اشیا کی قدر و قیمت کی تقابلی تحقیق کرنے والی تنظیم 'ورلڈ ویلیو سروے' (worldvaluesurvey.org) کی رپورٹ کے مطابق لوگوں میں اپنا پرائیویٹ کام شروع کر کے دوسروں کو کچھ دینے کا جذبہ سب سے کم ہندوستان میں ہے۔ فروری 2015 میں نئی مرکزی حکومت نے اپنا پہلا بجٹ پیش کیا، اس وقت موقع تھا کہ ڈرامائی انداز میں کچھ نیا کیا جاتا۔ کمپنیوں پر ٹیکس ریٹ گھٹا کے جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم 'آسیان' (ASEAN) کی سطح پر لایا جاسکتا تھا، اس سے 'میک ان انڈیا' کی واقعی حوصلہ افزائی ہوتی۔ بینک نیشنلائیزیشن قانون میں بڑی ترمیم کی جاسکتی تھی۔ وہ موقع نکل گیا، اب تو زمینی حقیقت وہی پرانی ہے کہ ملکی باشندہ کی اوسط آمدنی (Per capita income) اتنی کم ہے اور اقتصادی بنیاد اس قدر نیچی ہے کہ ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر میں رسائی آسان ہے اور حکمراں جماعت کو پارلیمنٹ میں زیادہ نشستیں ملنے کے باوجود عوامی سطح پر کوئی اقتصادی بہتری آنے والی نہیں ہے، جیتنے کے بعد سے ہی فکر شروع ہو جاتی ہے کہ اگلا الیکشن کیسے جیتا جائے گا اور ملک بیچارہ فطری اچھال (Natural buoyancy) کے باعث اپنی نچلی سطح پر ہی رینگتا رہتا ہے۔

ایک ایشو ہے ہندوستان کے بالمقابل باقی دنیا میں بے روزگاری کے قلیل فیصد کا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں صرف ہنگری اور افغانستان دو ہی ملکوں میں روزگار کی عمر والے لوگوں کی آبادی میں کمی آنی شروع ہوئی تھی، لیکن اب مع چین، جاپان، اٹلی و جرمنی کے دنیا کے 40 ملکوں میں روزگار کی عمر والی آبادی سکڑ رہی ہے، آبادیاتی ترتیب میں اس تبدیلی کی وجہ سے فی الوقت دنیا میں بے روزگاری 40 برس میں سب سے کم ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں بے روزگاری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دراصل دنیا کے ممالک کم لاگت سے اچھا مال بنا کے اسے ایکسپورٹ کر کے اپنے یہاں خوشحالی لاتے ہیں، اسی سے روزگار میں بھی اضافہ ہوتا ہے، لیکن ہندوستان میں پانچ برس قبل صنعت کاری (Manufacturing industry) کل قومی پیداوار (GDP) کا 16 فیصد تھی اور اب بھی اتنے پر ہی ٹکی ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں مزدوری کا قانون ترمیم مانگتا ہے، کارخانوں میں انفرااسٹرکچر میں بہت زیادہ بہتری وجدت کی ضرورت ہے۔ موجودہ حکومت کے آنے سے قبل دس برس میں اقتصادی ترقی کی در 9-8 فیصد ہونے کی یہ بھی وجہ تھی کہ اس دوران ہر سال ایکسپورٹ میں 30 فیصد کا اضافہ ہوتا تھا جو کہ اب گھٹ کے 10 فیصد رہ گیا ہے۔ لہٰذا مستقبل قریب میں ہماری قومی اقتصادی بالیدگی 7-6 فیصد سے بڑھ کے 9-8 فیصد ہو جائے اس کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ ہندوستان میں ان کھرب پتیوں کی تعداد جنھیں دولت وراثت میں ملی ہے، کل کھرب پتیوں کا 60 فیصد ہے، یہ فیصد عالمی اوسط کے مقابلہ میں دوگنا ہے، اس کو بھی ہماری سماجی کج روی کہا جائے گا۔ حالات کو سدھارنے کے لیے ہندوستان میں صوبوں کو زیادہ طاقتور بنانا ہوگا، انھیں مخصوص اقتصادی زون بنانے کے لیے راغب کرنا ہوگا۔ صوبوں میں آپس میں مقابلہ ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری اپنے یہاں کرواسکیں، اسے کہا جائے گا تقابلی وفاقیت (Competitive Federalism)۔ ساتھ ہی بینکوں کو زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر میں لانا ہوگا اور عوام کو اپنے اندر کام کے لیے جذب و جنوں پیدا کرنا ہوگا۔

❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 22 Mar-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

ملکی اقتصادی حالات میں سدھار کا نسخہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

رُچِر شرما تجارتی مارکیٹ کے عالمی ماہر(Market strategist)ہونے کے ساتھ مشہور بین الاقوامی کمپنی مورگن اسٹینلے انویسٹمنٹ مینجمنٹ کے ہیڈ بھی ہیں، مختلف ممالک میں ان کے 600دفتر ہیں۔ وہ دنیا بھر میں اہم کانفرنسز میں مدعو کیے جاتے ہیں، تاکہ اقتصادی رجحانوں کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور بتائیں کہ پالیسی میں کہاں کیا کمی ہے،جس میں تبدیلی کرکے عوام کی فلاح کے لیے بہتری لائی جاسکتی ہے۔دو روز قبل ایک مشہور ٹی وی چینل کے ذریعہ منعقد اقتصادی چوٹی کانفرنس میں، جس میں وزیراعظم نریندر مودی نے بھی خطاب کیا، رچر شرما بھی شامل ہوئے اور بعد میں ٹی وی پر ان کا انٹرویو نشر ہوا،جس میں انھوں نے کہا کہ گزشتہ 25 برس سے وہ ہندوستان کے اقتصادی حالات پر مستقل گہری نظر رکھے ہوئے ہیں، دو برس قبل تک میڈیا کے مطابق ملک میں بڑا پُر اُمید ماحول تھا کہ جلد ہی قومی اقتصادی بالیدگی(National Economic Growth) بڑھ کر 10-8 فیصد ہو جائے گی، لیکن ایسا ہوا نہیں۔حالانکہ اب عالمی معاشیات سازگار ہیں لیکن گزشتہ 18 ماہ کی اس وسیع حیات تازہ(Global Economic Revival)میں ہندوستان کچھ خاص اشتراک نہیں کرسکا۔اس کی صریح وجوہ نوٹ بندی اور جی ایس ٹی کا ناقص نفاذ ہیں، ساتھ ہی حال کے برسوں میں ہندوستان میں بینکوں کے نظام میں ڈھیلا پن بھی اس منفی صورت حال کے لیے قصوروار ہے۔

ہندوستان میں دوتہائی اثاثہ ان بینکوں کے پاس رہتا ہے جو حکومت کے زیرنگرانی ہیں اور یہ تناسب جمہوری ممالک میں نقصاندہ حد تک زیادہ اور بے جوڑ ہے۔ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب عموماً ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوتا ہے، وہ بھی اس وجہ سے کہ سماجی ہدف کے حصول کے لیے اتنی مقدار ہر ملک کے لیے ضروری ہے، لیکن ہندوستان جیسا کوئی بھی ملک نہیں ہے جہاں یہ تناسب اس قدر بے توازن و ناہموار ہو۔ اگر نفع بخش اضافہ پذیر مالی سرگرمی کو زیر غور لایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے متعلق زیادہ تر کارروائی پرائیویٹ سیکٹر کے بینکوں کے ذریعہ ہو رہی ہے، مثلاً تجارتی سرمایہ کاری، کریڈٹ و ڈیبٹ کارڈ، آن لائن پیمنٹ اور بڑی خردہ تجارت کی قیادت۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بینکنگ سیکٹر پھر بھی بے خبری و غفلت کی وجہ سے

”یہ بھی ایشو باعث تشویش ہے کہ 2014 سے اب تک 23,000 کروڑ پتی افراد ہندوستان سے باہر جا چکے ہیں، یہ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ملک میں کل کروڑ پتیوں کی تعداد کے تناسب کے اعتبار سے یہ انخلا (Exodus) دنیا میں سب سے زیادہ ہے، جبکہ ملک میں زیادہ سرمایہ کاری اندرون ملک ہی ہونی چاہیے۔“

پرائیویٹ ہاتھوں کی طرف گامزن ہے،لیکن ملک کو اس پراگندگی کا خمیازہ بھگتنا پڑسکتا ہے۔ادھر پبلک سیکٹر کے بینکوں کے وصف میں کمی آرہی ہے اور ملک کی اقتصادی صحت یابی خرابی کا باعث بنتی جارہی ہے۔بہتر یہ ہوگا کہ بینکنگ سسٹم میں اصلاحات کرکے سمجھی بوجھی پالیسی کے تحت سرکاری سیکٹر کی معقول حصہ داری پرائیویٹ سیکٹر میں منتقل کی جائے،سرکار کے زیرنگرانی بینکوں میں بھی قرض دیتے وقت بیجا سختی سے پرہیز کرنا ہوگا،غیر ضروری انضباطی تجاوز(Regulatory overkill)سے گریز کرنا ہوگا، تاکہ وہاں قرض دینے کی کارروائی ماند نہ پڑجائے۔یاد رکھئے کہ پرائیویٹ بینک پھر بھی قرض دینا جاری رکھیں گے،لیکن وہ بڑی کمپنیوں کی جانب زیادہ توجہ دیتے ہیں اور یہ بڑی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں مالدار لوگ اور زیادہ مالدار ہوتے جارہے ہیں ، بڑی کمپنیاں چھوٹی کمپنیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں۔یہ بھی ایشو باعث تشویش ہے کہ 2014 سے اب تک 23,000 کروڑ پتی افراد ہندوستان سے باہر جاچکے ہیں، یہ تعداد بڑھتی ہی جارہی ہے۔ملک میں کل کروڑ پتیوں کی تعداد کے تناسب کے اعتبار سے یہ انخلا(Exodus)دنیا میں سب سے زیادہ ہے، جبکہ ملک میں زیادہ سرمایہ کاری اندرون ملک ہی ہونی چاہیے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج سرمایہ کاری کے لیے سب سے زیادہ چاہے جانے والی جگہیں ہیں دبئی، سنگاپور، امریکہ، انگلینڈ وغیرہ۔ہمیں ان اقدامات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے،جس سے ہمارا ملک اقتصادی میدان میں اگلا چین بن سکے۔ طریقہ حکمرانی میں چین سے مختلف ہونے کے باوجود ہمیں ایسی ترکیبیں کرنی ہوں گی کہ ہم اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔وہاں شخصی فرماں روائی ہے لیکن ہماری جمہوریت میں سیاست کی اہمیت بیجا طور پر بہت زیادہ ہے۔ ہماری سمجھداری اس میں ہوگی کہ الیکشن کے نتائج کا اثر ملک کی اقتصادی صورت حال پر بالکل بھی نہیں پڑنا چاہیے، سیاسی ردوبدل کے باوجود ملک کا معاشی مدار اپنی ڈھری پر چلتے رہنا ہی نہیں، بلکہ ترقی پذیر رہنا چاہیے۔دنیا کے ممالک میں مختلف اشیا کی قدر و قیمت کی تقابلی تحقیق کرنے والی تنظیم 'ورلڈ ویلیو سروے (worldvaluesurvey.org) کی رپورٹ کے مطابق لوگوں میں اپنا پرائیویٹ کام شروع کر کے دوسروں کو کچھ دینے کا جذبہ سب سے کم ہندوستان میں ہے۔ فروری 2015 میں نئی مرکزی حکومت نے اپنا پہلا بجٹ پیش کیا، اس وقت موقع تھا کہ ڈرامائی انداز میں کچھ نیا کیا جاتا۔ کمپنیوں پر ٹیکس ریٹ گھٹا کے جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم 'آسیان' (ASEAN) کی سطح پر لایا جاسکتا تھا، اس سے 'میک ان انڈیا' کی واقعی حوصلہ افزائی ہوتی۔ بینک نیشنلائیزیشن قانون میں بڑی ترمیم کی جاسکتی تھی۔ وہ موقع نکل گیا،اب تو زمینی حقیقت وہی پرانی ہے کہ ملکی باشندہ کی اوسط آمدنی(Per capita income)اتنی کم ہے اور اقتصادی بنیاد اس قدر نیچی ہے کہ ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر میں رسائی آسان ہے اور حکمراں جماعت کو پارلیمنٹ میں زیادہ نشستیں ملنے کے باوجود عوامی سطح پر کوئی اقتصادی بہتری آنے والی نہیں ہے، جیتنے کے بعد سے ہی فکر شروع ہوجاتی ہے کہ اگلا الیکشن کیسے جیتا جائے گا اور ملک بیچارہ فطری اچھال(Natural buoyancy) کے باعث اپنی نچلی سطح پر ہی رینگتا رہتا ہے۔

ایک ایشو ہے ہندوستان کے بالمقابل باقی دنیا میں بے روزگاری کے قلیل فیصد کا۔ بیسویں صدی کے اواخر میں صرف ہنگری اور افغانستان دو ہی ملکوں میں روزگار کی عمر والے لوگوں کی آبادی میں کمی آنی شروع ہوئی تھی، لیکن اب مع چین، جاپان، اٹلی وجرمنی کے دنیا کے 40 ملکوں میں روزگار کی عمر والی آبادی سکڑ رہی ہے، آبادیاتی ترتیب میں اس تبدیلی کی وجہ سے فی الوقت دنیا میں بے روزگاری 40 برس میں سب سے کم ہے۔اس کے برخلاف ہندوستان میں بے روزگاری بہت بڑھی ہوئی ہے۔ دراصل دنیا کے ممالک کم لاگت سے اچھا مال بنا کے اسے ایکسپورٹ کر کے اپنے یہاں خوشحالی لاتے ہیں، اسی سے روزگار میں بھی اضافہ ہوتا ہے، لیکن ہندوستان میں پانچ برس قبل صنعت کاری (Manufacturing industry) کل قومی پیداوار(GDP) کا 16 فیصد تھی اور اب بھی اتنے پر ہی ٹکی ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں مزدوری کا قانون ترمیم مانگتا ہے، کارخانوں میں انفرااسٹرکچر میں بہت زیادہ بہتری وجدت کی ضرورت ہے۔موجودہ حکومت کے آنے سے قبل دس برس میں اقتصادی ترقی کی در 9-8 فیصد ہونے کی یہ بھی وجہ تھی کہ اس دوران ہر سال ایکسپورٹ میں 30 فیصد کا اضافہ ہوتا تھا جو کہ اب گھٹ کے 10 فیصد رہ گیا ہے۔ لہٰذا مستقبل قریب میں ہماری قومی اقتصادی بالیدگی 7-6 فیصد سے بڑھ کے 9-8 فیصد ہو جائے اس کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ ہندوستان میں ان کھرب پتیوں کی تعداد جنھیں دولت وراثت میں ملی ہے،کل کھرب پتیوں کا 60 فیصد ہے، یہ فیصد عالمی اوسط کے مقابلہ میں دوگنا ہے، اس کو بھی ہماری سماجی کج روی کہا جائے گا۔ حالات کو سدھارنے کے لیے ہندوستان میں صوبوں کو زیادہ طاقتور بنانا ہوگا، انھیں مخصوص اقتصادی زون بنانے کے لیے راغب کرنا ہوگا۔صوبوں میں آپس میں مقابلہ ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری اپنے یہاں کرواسکیں، اسے کہا جائے گا تقابلی وفاقیت (Competitive Federalism)۔ ساتھ ہی بینکوں کو زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر میں لانا ہوگا اور عوام کو اپنے اندر کام کے لیے جذب و جنوں پیدا کرنا ہوگا۔

❒❖❒

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آراان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 29 Mar-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

مساجد کی اہمیت: سپریم کورٹ کے سوال کا جواب

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

"دین اسلام صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دنیا میں نہیں آیا ہے بلکہ وہ کل کرہ ارض کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ کسی خوب صحت یاب انسان کے مثبت حال کا راز جاننے کے لیے اس کے کسی ایک عضو کے اندرونی وجود کا تجزیہ بہت کارآمد نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے پورے سسٹم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوگی۔"

سپریم کورٹ نے حال میں کہا ہے کہ وہ جاننا چاہتی ہے کہ مسجد کا وجود مذہب اسلام کے لیے لازمی جز ہے کہ نہیں، بڑی خوشی کی بات ہے کہ عدالت عظمیٰ یہ علم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کریم میں نماز کا ذکر 79 مقامات پر آیا ہے' اس کے لیے عربی لفظ صلوٰۃ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں رابطہ یعنی نماز کا مقصد ہے پروردگار سے رابطہ قائم کرنا، نماز پابندی وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے (4.103)، نماز سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے (13.28)، خشوعِ نماز سے فلاح حاصل ہوتی ہے (2-23.1)، یہ تقویت اور خدا کی مدد کا ذریعہ ہے (2.153)، نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے (29.45)۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی مسجد حرام اور یروشلم کی مسجد الاقصیٰ کا ذکر کیا ہے (17.1) اور یہ بھی بتایا ہے کہ حضور اقدسؐ سفر معراج سے قبل مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تشریف لے گئے تھے۔ اسی سفر کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو نماز پنجگانہ کا حکم دیا اور یہ نمازیں اسلام کا لازمی جز ہیں۔ سورہ البقرہ میں کہا گیا کہ دیگر جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی جھکا کرو (2.43)، حدیث نبویؐ کے مطابق اس آیت میں نماز باجماعت کا حکم دیا گیا ہے (صحیح بخاری و مسلم)۔ سورہ الاعراف میں (7.29) مسجد میں عبادت کرنے کا اور (7.31) مسجد کے اندر اچھی پوشاک پہننے کا حکم دیا' مسجد کے اندر منبر و محراب اور وضو کا مخصوص انتظام ہوتا ہے، موذن اذان دیتے ہیں۔

پھر وضاحت کی گئی کہ دوران رمضان المبارک جب کوئی مرد مسجد میں اعتکاف میں ہو تو اس پر کیا پابندیاں عائد ہوتی ہیں (2.187)۔ مسجد اقصیٰ میں حضور اکرمؐ نے نماز میں تمام انبیا کی امامت فرمائی تھی۔

ابوداؤد میں ذکر ہے کہ پیغمبر حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ جماعت میں جتنے زیادہ لوگ ہوتے ہیں اللہ کو اتنا ہی زیادہ یہ اجتماعی عمل پسند آتا ہے۔ وہ خود باجماعت نماز نہیں چھوڑتے تھے بلکہ علالت میں بھی ساتھیوں کی مدد سے جماعت کے لیے جاتے تھے۔ فرمایا کہ نماز باجماعت انفرادی نماز کے مقابلہ میں 27 گنا بہتر مانی جاتی ہے۔ باوضو باجماعت نماز کے لیے تیار شخص کے حق میں فرشتے دعا کے لیے تعینات رہتے ہیں۔ کسی گاؤں یا صحرا میں تین یا اس سے زیادہ افراد ہوں اور وہ اذان دے کر نماز باجماعت نہ پڑھیں تو ان پر شیطان غالب آسکتا ہے جس طرح بھیڑیا اسی بھیڑ پر حملہ کرتا ہے جو ریوڑ سے علیحدہ ہو (احمدؒ النسائی، ابو داؤد)۔ ایک نابینا کے پوچھنے پر فرمایا کہ موذن کی آواز سن کے اسی کے سہارے مسجد آجایا کرو، مسجد تک چل کر جانے میں بڑا ثواب ہے۔ نماز باجماعت میں شانہ بشانہ کھڑے ہونا ہوتا ہے اور ایڑیوں کی موافقت سے صف آرائی کی جاتی ہے اس سے آپس میں اتحاد کو فروغ ملتا ہے۔ خشوع نماز سے حاصل شدہ تابانی و درخشانی مقتدیوں کے مابین ایک دوسرے میں سرایت ہوتی رہتی ہے۔ انفرادی انا و خودغرضی سے پیدا ہونے والی عدم مساوات کی روش اختتام پذیر ہو جاتی ہے، شیطانی خصلتیں دور ہونے لگتی ہیں۔

قرأت میں ماہر ترین شخص کا امامت کے لیے پہلا حق ہے، پھر سنت کا زیادہ علم رکھنے والے کا، پھر زیادہ عمر والے کا (مسلم)۔ خواتین مسجد جائیں لیکن ان کے لیے الگ پردہ والی جگہ ہو اور وہ سادگی اپنائیں (احمد و ابوداؤد)۔ حدیث کے مطابق بچوں کو 7 برس کی عمر سے نماز کی تلقین کی جانی چاہیے اور 10 برس کی عمر سے قدرے سختی شروع کر دی جائے۔ سجدہ کی حالت اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے اس دوران انسان کے دل کی سطح اس کے دماغ سے اوپر ہوتی ہے، وہ اپنے دل سے عشق خدا میں مصروف رہتا ہے، اس وقت دماغ پر دل غالب آجاتا ہے، روح کو جسم پر سبقت ملتی ہے۔ جب انسان نماز باجماعت کے ارادہ سے مسجد کی طرف گامزن ہوتا ہے تو اس کے ہر قدم پر اللہ اس کے حق میں ایک نیکی لکھ دیتے ہیں، اس کا درجہ ایک ڈگری بڑھ جاتا ہے اور اس کا ایک گناہ معاف کر دیا جاتا ہے (صحیح مسلم)۔ صحابۂ کرامؓ کا اصول تھا کہ اذان ہوتے ہی اپنا کام دھندہ روک کر مسجد میں نماز باجماعت میں شامل ہو جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی مقصد جماعت کے متعلق فرماتے ہیں کہ سماج کے اکابر، ممتاز شخصیات، عوام، بوڑھے، نوجوان، بچے سب ایک ساتھ اللہ کے حضور بار بار صف آرا ہوں جس طرح کی مثال دنیا میں دیکھنے کو نہ ملے اور یہی جذبہ اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد بن جاتا ہے۔

انھی اسلامی احکامات کی ادائیگی کے لیے حضور اقدسؐ نے مسجد نبوی قائم کی تھی جہاں سے وہ نماز باجماعت کی ادائیگی کے ساتھ ملک و سماج کے انتظام و انصرام اور عدالتی فیصلوں کے کام بھی کرتے تھے۔ دنیا میں سماجی مساوات کی مثال قائم ہوئی بلال حبشیؓ کو اذان دینے کے لیے مدعو کر کے۔ تبھی سے مسجد کے احاطے ہر طرح کی مثبت تعلیم و تربیت کے مقام بھی بنے ہوئے ہیں۔ جمعہ کا ہفتہ وار خطاب کا طریقہ پوری دنیائے اسلام میں رائج ہے، ان خطبات پر مختلف زبانوں میں کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، اکثر جگہوں پر عقد نکاح مسجد میں منعقد کیا جاتا ہے۔ انتقال کے بعد مسلمان کی نماز جنازہ بھی مسجد میں پڑھی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں نماز کے لیے جانماز اور صف، ٹوپیاں وغیرہ بہت بڑی تعداد میں تیار کی جاتی ہیں، آج کل چین اس صنعت میں سبقت لیے ہوئے ہے۔ امریکہ و انگلینڈ وغیرہ میں اگر کسی ادارہ میں مسجد نہیں ہوتی ہے تو وہاں ایک بڑا ہال نماز کے لیے مہیا کر دیا جاتا ہے، دہلی کے اپولو اسپتال میں بھی نماز کے لیے اسی طرح کی بڑی جگہ مختص ہے۔ دنیا بھر کی مساجد میں نماز باجماعت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ کو مرکز بناتے ہوئے چوبیس گھنٹے ہر منٹ ہر سیکنڈ دنیا کو قطار در قطار دائروں میں تصور کیا جاسکتا ہے، اس میں سے کم از کم 90 فیصد نمازی مساجد میں باجماعت نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نماز کے اوقات طے ہوتے ہیں سورج کے طلوع و غروب وغیرہ سے۔ اس خدائی نظام کو امید ہے کہ سپریم کورٹ کے جج صاحبان سمجھ کے اسلام میں مساجد کے وجود کی اہمیت کی قدردانی کریں گے۔

یہی سب وجوہ ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں بھی لاکھوں مساجد کی ذمہ داری صوبائی وقف بورڈوں کو دی گئی ہے۔ یہ بورڈ پارلیمنٹ کے ذریعہ پاس شدہ وقف قانون کے تحت کام کرتے ہیں۔ دراصل پورے عالم میں ہی مساجد و اوقاف کا گہرا تعلق ہے، زیادہ تر مساجد کی جائدادیں وقف ہیں۔ اوقاف کا نظام بھی قومی قوانین کے ذریعہ ہوتا ہے، ملکوں میں وزارت اوقاف قائم ہیں۔ مساجد کے اماموں کی تنظیمیں بھی بنی ہوئی ہیں، مساجد کی کمیٹیاں اور متولی اپنا کام کر رہے ہیں۔ میری ادنیٰ رائے میں عدالت عظمیٰ کے جج صاحبان کو ہندوستانی مسلمانوں کے دین اور اس سے منسلک اداروں کی افادیت کو سمجھنے کے لیے پورے عالم اسلام میں بھی اس سے متعلق اداروں اور ان کی اہمیت پر غور کرنا ہوگا، کیونکہ دین اسلام صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دنیا میں نہیں آیا ہے بلکہ وہ کل کرہ ارض کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ کسی خوب صحت یاب انسان کے مثبت حال کا راز جاننے کے لیے اس کے کسی ایک عضو کے اندرونی وجود کا تجزیہ بہت کارآمد نہیں ہوسکتا ہے بلکہ اس کے پورے سسٹم کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہوگی۔ پورے جسم کی درون افرازی کی وجہ ریزش غدود کی تحقیق سے ہی معلوم ہوسکتی ہے، معلوم کرنا ہوگا کہ ہارمون کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور اعضا کی توانائی کا راز کیا ہے۔

❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 05 Apr-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

شام وفلسطین: مشرقِ وسطیٰ کے سنگین حقائق

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

> ”مشرق وسطیٰ میں جاری تصادم سے پیدا شدہ متعدد جذباتی نفرتوں واندیشوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خصوصاً غزہ کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے پورے علاقہ میں ہی آتشزدگی کے خطرات لاحق ہیں۔ ادھر ملک شام کے موجودہ تنازع میں اس خطہ اور پورے عالم کی وہ تمام طاقتیں ملوث ہیں جو اس قطعہ زمین کا استعمال اپنے مفادات کو مستحکم کرنے کے لیے کررہی ہیں۔“

فلسطین کی زمین پر 1948 میں اسرائیل کے ذریعہ زبردستی قبضہ کے بعد 7,00,000 فلسطینی عرب وہاں سے نکال دیے گئے یا مجبوراً ہجرت کر گئے، اس کو فلسطینی النکبہ کہتے ہیں، یعنی آفت ناگہانی۔ اس کے خلاف گزشتہ جمعہ کو قطاع غزہ میں 30,000 فلسطینیوں نے ’واپسی کے لیے کوچ‘ (March of Return) مظاہرہ کیا، یہ لوگ ’یوم زمین‘ (Land Day) کی برسی منا رہے تھے جس دن 1976 میں ایسا پہلا کوچ منعقد کیا گیا تھا جس میں 6 فلسطینی جاں بحق ہوئے تھے۔ اس دفعہ پھر 30 مارچ کو اسرائیلی مسلح افواج کے ذریعہ نہتھے احتجاجیوں پر چھپ کر چلائی گئی (Snipers) گولیوں سے 16 فلسطینی شہید اور 1400 زخمی ہو گئے۔ یہ احتجاجات جاری رہیں گے 14 مئی تک، جب قیام اسرائیل کے 70 برس پورے ہونے والے ہیں۔ اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری اور یوروپین یونین کے امور خارجہ کے ہیڈ نے اسرائیل کے ذریعہ کی گئی اس گولی باری کی آزادانہ تحقیق کرنے کے لیے آواز اٹھائی ہے جس کو اسرائیلی وزیر دفاع نے ’منافق فریبیوں کی سر تال‘ (Chorus of hypocrites) سے تعبیر کیا۔ اسرائیل کی حقوق انسانی تنظیم نے اسرائیلی کارروائی کی مذمت کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ گولی چلانے والوں سے لے کر ان کے سینئر افسروں تک کسی کو بھی اس معاملہ میں ذمہ دار قرار نہیں دیا جائے گا اور بائیں بازو کے لیڈر تمر زیند برگ نے اسرائیلی حکومت سے کہا ہے کہ وہ خود بھی اس ناجائز حرکت کی تحقیق کرے۔

قطاع غزہ (Gaza Strip) 6 سے 12 کلومیٹر چوڑا اور 41 کلومیٹر لمبا ہے اور اس 365 مربع کلومیٹر زمین کے ٹکڑے پر 20 لاکھ فلسطینی عرب رہتے ہیں۔ اسرائیل نے 2005 میں وہاں سے اپنی فوجیں ہٹالی تھیں لیکن وہ اس کی زمین، بحری حدود اور فضائی رقبہ پر اپنا مکمل کنٹرول رکھتا ہے۔ غزہ کی 30 فیصد زمین پر زراعت اس وجہ سے نہیں ہوسکتی ہے کیونکہ اسے اسرائیل نے دو دشمنوں کے درمیان خالی علاقہ (Buffer zone) بنا رکھا ہے۔ 2007 سے اسرائیل نے غزہ کی ناکہ بندی بھی کر رکھی ہے جس کی وجہ سے وہاں کے 70 فیصد لوگ بے روزگار ہیں اور 80 فیصد لوگ زبردست غربت کے شکار ہیں۔ ادھر وسط مارچ میں امریکہ نے واشنگٹن میں ”اندرون غزہ لوگوں کی پریشانیوں کے حل کے لیے“ عالمی کوشش پر ایک کانفرنس منعقد کی، تاکہ غزہ کی اقتصادی حالت بہتر بنائی جا سکے، خصوصاً وہاں تیل وگیس کے امکان کے مدنظر۔ بین الاقوامی امور کے ماہرین کا خیال ہے کہ دراصل اس بہانہ سے بحیرہ قلزم (Mediterranean Sea) کی زمین دوز توانائی میں بڑی طاقتوں کے مفادات کے فروغ کے لیے امریکہ کچھ پلان بنا رہا ہے۔ کانفرنس میں فلسطین کا کوئی نمائندہ نہیں تھا جبکہ اسرائیل، مصر، اردن، سعودی عرب، قطر، بحرین، عمان اور متحدہ عرب امارات کے 19 نمائندے موجود تھے۔ دوحہ کی الجزیرہ نیوز ایجنسی کا خیال ہے کہ یہ غزہ میں اسرائیلی مداخلت کا جواز تیار کیا جا رہا ہے۔

مشرق وسطیٰ میں جاری تصادم سے پیدا شدہ متعدد جذباتی نفرتوں واندیشوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خصوصاً غزہ کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے پورے علاقہ میں ہی آتشزدگی کے خطرات لاحق ہیں۔ ادھر ملک شام کے موجودہ تنازع میں اس خطہ اور پورے عالم کی وہ تمام طاقتیں ملوث ہیں جو اس قطعہ زمین کا استعمال اپنے مفادات کو مستحکم کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔ حکومت شام نے 13 مارچ کو اعلان کیا کہ اس کی فوج نے دمشق سے متصل مشرقی غوطہ کے 60 فیصد حصہ پر قبضہ کر لیا ہے کیونکہ اس سے قبل روس اور شام کی فوجوں نے ہر سمت سے زبردست ہوائی وزمینی حملے کیے تھے جس کے نتیجہ میں مع بچوں کی بڑی تعداد کے 1,000 سے زائد شہری مار دیے گئے اور سیکڑوں زخمی ہو گئے۔ دمشق میں مقیم بشر حافظ الاسد کی حکومت کو ایران کی پشت پناہی حاصل ہے جس نے اس کام کے لیے لبنان میں تعینات حزب اللہ کے علاوہ اپنے اسلامی انقلابی ساحلی گارڈ (Islamic Revolutionary Coast Guard) کو لگا رکھا ہے۔ یہ اشتراک حزب اللہ کو مضبوط بنانے، لبنان میں اثر انداز ہونے اور اسرائیل کو ہراساں رکھنے کے لیے بھی ایران کو اہل بناتا ہے۔ بشر الاسد کی حکومت کو روس کی فوجی وسیاسی حمایت حاصل ہے جو شام کے موجودہ منظر نامہ میں اس لیے شامل ہوا تھا تاکہ خارجی مداخلت کے ذریعہ وہاں تبدیلی حکومت کو روکا جا سکے لیکن بعد میں وہ ایران اور ترکی کے اتفاق رائے سے وہاں قیام امن کے لیے ٹھہر ہی گیا۔ یاد کیجیے کہ 2011 سے ہی دمشق میں تبدیلی حکومت کے لیے سعودی عرب بھی صف اول میں تھا پھر 2016 میں روس کی مداخلت کے بعد ہی وہ قائل ہوا کہ وہاں خارجی فوجی کارروائی بے سود ہے اور اب وہ روس کی قیادت میں قیام امن کی کاوش پر راضی ہے۔ شروع میں ترکی نے بھی شام میں تبدیلی حکومت کے لیے سعودی عرب اور قطر کا ساتھ دیا تھا لیکن دو برس قبل اسے احساس ہوا کہ اس لڑائی کی وجہ سے شامی کردوں کو یہ طاقت ملنے لگی کہ وہ ترکی اور شام کی سرحد پر اپنے ایک آزاد وطن کے قیام کی طرف گامزن ہوں جو ترکی کی کردستان ورکرس پارٹی کے غیر مقلد کردوں کے لیے پناہ گاہ بن سکتا ہے۔ اس لیے اب ترکی نے بھی شام میں تبدیلی حکومت کی کوشش ختم کر دی ہے اور اب وہ بھی روس اور ایران کے ساتھ قیام امن میں لگ گیا ہے۔

امریکہ نے پہلے تو شام میں کچھ خاص دلچسپی نہیں لی تھی لیکن حال میں اسے شام میں روس کی کامیابی اپنے عالمی مفادات کے لیے نقصاندہ لگنے لگی ہے۔ گزشتہ جنوری میں اس وقت کے سکریٹری آف اسٹیٹ ریکس ٹیلرسن نے اچانک حیران کن اعلان کیا کہ گوکہ داعش کی شکست ہوگئی ہے اور وہ دہشت گرد تنظیم کافی حد تک منتشر کر دی گئی ہے پھر بھی امریکہ کرد علاقہ میں اپنے 2,500 فوجی تعینات رکھے گا اور امریکی خرچ پر 30,000 کرد پیادوں کی فوج تیار کرے گا۔ ٹیلرسن کے مطابق یہ فوج یقینی بنائے گی کہ داعش شام میں واپس نہیں لوٹے اور وہاں ایران کی بااثر موجودگی بھی نہیں رہ پائے گی۔ اس سے لگتا ہے کہ خدانخواستہ شام کے دو حصے ہو جائیں۔ دریائے الفرات (Euphrates) کے مشرقی ساحل پر کرد کنٹرول والے شمال مشرقی شام میں امریکہ اپنی موجودگی کو مستحکم کرے گا، شام میں ایران کو بے تاثیر کرے گا اور تہران سے بغداد و دمشق تک پلوں وسڑک کا راستہ (Causeway) بننے میں دقتیں پیدا کرے گا جس کا وجود امریکہ واسرائیل کے لیے ایک ڈراؤنے خواب جیسا ہے اور وہ شام میں دیر الزور نامی تیل وگیس کے خزانے پر اپنا کنٹرول رکھے گا۔ شام وترکی کی سرحد پر عافرین سے منبج تک 100 کلومیٹر لمبائی میں ترکی کے ذریعہ ’محفوظ خطہ‘ قائم کرنے کے لیے ترکی کو امریکی اجازت مل جائے گی تاکہ ترکی اپنی سرحد پر کردی شورش پر نظر رکھ سکے، اس کے عوض میں ترکی سے امید کی جائے گی کہ وہ شام میں قیام امن کی کوششوں سے دور رہے۔ ادھر شام میں طرطوس اور حمیمیم میں روس اپنے بحری وفضائی اڈوں پر کنٹرول برقرار رکھے گا لیکن علاقہ میں روسی اثر کی حدت میں کافی کمی ضرور آجائے گی اور امریکہ خود مشرق وسطیٰ کے طاقتور ممالک کے درمیان ثالثی رول ادا کرے گا۔ اس صورت حال میں علاقہ میں اگلی لڑائی کے لیے میدان صاف ہو جانے کا خطرہ ہے۔ کئی خلیجی ممالک میں تعینات رہ چکے ہندوستان کے سابق سفیر تلمیذ احمد اور ان کے رفقاء کار کا کہنا ہے کہ شام ولبنان میں ایرانی مفادات کو نشانہ بنا کے اسرائیل، اردن اور امریکہ مشترکہ حملہ کر سکتے ہیں اور باقاعدہ جنگ بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اندرون شام بھی امریکی قبضہ کے خلاف بغاوتی تحریک (Insurgency) جنم لے سکتی ہے جس طرح 2003 سے عراق میں شروع ہو کر ایسی ہی بغاوت نے 2011 میں وہاں سے امریکی فوج کے خروج کے بعد ہی چین لیا تھا۔ مقام افسوس ہے کہ بہرصورت مستقبل قریب میں مشرق وسطیٰ میں امن کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔

❐❖❐

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 12 Apr-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

قرآن

صحت تلاوت کے اہتمام والتزام کی اہمیت

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”سید صاحب فن تجوید کے ماہر استاد تھے۔ان کے دل کی یہ خاص تڑپ اور لگن تھی کہ مسلمانوں میں قرآن پاک کی تلاوت صحیح طور پر کرنے کی ضرورت کا عام احساس ہو جائے اور اس کے لیے قواعد تجوید اور قرآنی الفاظ کے مخارج اور صفات وخصوصیات کے بارے میں جتنی واقفیت ضروری ہے، ہر تلاوت کرنے والا اتنی واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھے۔“

قرآن کریم کو صحیح طور پر پڑھنے کے لیے بیالیس برس قبل زندگی کے آخری ایام میں شہید حجاز ملی قائد سید محمود حسن نے ملت اسلامیہ ہند کے نام اپنی وصیت میں ہمارے معاشرہ کو چار طبقوں میں تقسیم کیا تھا، اول وہ جو دینی مدارس میں باضابطہ طور پر علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس میں علما، امت مدارس کے اساتذہ اور طلبا شامل ہیں۔دوم، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے پروفیسر و دیگر اساتذہ، سرکاری و نیم سرکاری عہدہ دار، وکلا، ڈاکٹر، انجینئر، چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ وغیرہ اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص جو تجارت، صنعت اور زراعت جیسے مختلف پیشوں میں مشغول ہیں۔سوم، وہ جو ہندی یا دیگر ہندوستانی زبانوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور چوتھا طبقہ ان بے شمار ہندوستانی مسلمانوں کا ہے جو یا تو بالکل انپڑھ ہیں یا کم پڑھے لکھے ہیں۔پہلے دو طبقات کے لیے وصیت قلمبند کرنے کے بعد ہی سید صاحب دسمبر 1975 میں بعد الحج مکہ معظمہ میں رحلت فرما گئے، ان کے فرزندِ سعادتمند سید ناصر محمود نے اس دوران اپنے کو ان کی خدمت پر مامور کر رکھا تھا، انھیں ارکان حج مکمل کروائے اور بعد انتقال تمام انتظامات کیے، اللہ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔حرم شریف میں آٹھ لاکھ حجاج نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور سید صاحب وہیں جنت المعلیٰ میں مدفون ہیں، یہ ان کی مخلصانہ حق نوازی اور رندانہ توحید پرستی کا مقدس ثمر ہے۔

ملت کے نام وصیت کے مغز سے متعلق گفتگو سے قبل یہ تفصیل معلوم ہونا ضروری ہے کہ سید صاحب کا حلقہ طریقت ملک گیر ومحتوی الکثیر تھا اور اس میں خصوصاً شامل تھے۔مولانا حفظ الرحمٰن نامی، مولانا علی میاںؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید حمید الدین، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد منظور نعمانی، حکیم الاسلام، قاری محمد طیب، مولانا محمد ہاشم میاں فرنگی محلی، مولانا محمد یوسف، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا اسعد مدنی، شاہ معین الدین ندوی اور ان اصحاب بصیرت میں سے اکثر کی میزبانی کا بھی انھیں شرف حاصل تھا۔سید صاحب نے اپنی وصیت میں آگاہ کیا کہ ان کی سطور میں بے ساختہ آواز بھری ہوئی ہے، مداہنت ہو گی اگر اس آواز کو بے جا تکلفات کا جامہ پہنا کر اصل آواز چھپائی جائے، اس لیے اگر کسی جگہ پر نوک قلم سے کوئی ایسی عبارت نکل جائے جسے مخاطب طبقہ کے افراد بے ادبی پر محمول کریں تو اپنے اخلاص کا واسطہ دے کر ناگواری محسوس کرنے والے مخاطبین سے انھوں نے دست بستہ اور پیشگی معافی مانگ لی۔طبقہ اول کو علوم دینیہ کی باضابطہ تحصیل میں عمر عزیز کا گرانقدر حصہ کم وبیش صرف کر دینے کا فخر حاصل ہے، انہی صاحبان کو ہر زمانہ میں نیابت رسولؐ کا منصب جلیل تفویض رہتا ہے۔تمام علوم دینیہ کا سرچشمہ کلام الٰہی ہے اور ذکر الٰہی میں تلاوت قرآن پاک کا مقام خواہ وہ نماز میں ہو یا بیرون نماز، بہرحال بہت بلند ہے۔صحت تلاوت کا اہتمام والتزام غیر علما کے مقابلہ میں اس طبقہ پر کہیں زیادہ ضروری ہے، جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔مگر ملک کے مختلف اطراف میں صاحب وصیت کا مشاہدہ بارہا اس افسوسناک منظر پر ششدر رہ گیا کہ اس جماعت میں بھی بہ کثرت افراد حروف کے مخارج وصفات اور حرکات کے طرز ادا وغیرہ سے غیر مستغنی ہیں جبکہ ملت کو صحیح تعلیم دینے کی ان کی بڑی ذمہ داری ہے، ان کی ذرا سی ڈھیل کا عوام میں متواتر منفی اثر ہوتا ہے۔شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ اگر بادشاہ اپنے اہل کار کو اجازت دیتا ہے کہ وہ رعیت سے پانچ انڈے بزور بازو حاصل کر لے تو دراصل اس کے فوجی ہزاروں مرغے عوام سے چھین کر کھا جائیں گے:

به پنج بیضه که سلطاں ستم رواداری
زنند لشکر یانش ہزار مرغ به سیخ

طبقہ اول کے خواتین وحضرات وراثت ہندی کے بلند منصب کے حامل و امین ہیں اور انھی کی جماعت ملت اسلامیہ کا قلب وجگر ہے، ان کے کام کے عوض اللہ کے یہاں ان کے لیے انعام واکرام بھی زیادہ ہے۔سید صاحب نے طبقہ اول کو وہ حدیث نبویؐ یاد دلائی، جس میں کہا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے قلب کی روحانی صحت کی فکر کر لے تو سارا جسم ہی باطنی وظاہری طور پر ٹھیک رہتا ہے، لیکن اگر قلب کی ہی فکر نہیں کی تو وہ چوطرفہ منفی اثر ڈالتا ہے (بخاری و مسلم)۔چونکہ طبقہ اول کو سید صاحب نے ملت کا قلب مانا ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ملت کو جسم مانتے ہوئے اس کے قلب یعنی طبقہ اول کو اپنی روحانی صحت درست رکھنے کی زیادہ فکر کرنی ہوگی۔زبان نبوت کی اس تنبیہ سے اس طبقہ کو بے قرار ہو جانا چاہیے اور سرچشمہ ہدایت یعنی کلام الٰہی کی تلاوت کو بدرجہ اتم عوام کے لیے بہترین نمونہ بنا لینا چاہیے۔عوام کا طرز تلاوت عموماً قابل اصلاح ہوتا ہے، ان کی دینی رہنمائی طبقہ اول کے ذمہ بدرجہ اولیٰ ہے، اس لحاظ سے بھی ان کی تلاوت عوام الناس کے لیے مشعل راہ ہونی چاہیے۔ان فرائض کی انجام دہی میں لغزش یا کوتاہی پر اس طبقہ کی گرفت بھی زیادہ ہوگی، اس قول پر سورہ الاحزاب کی آیت 30 دلیل محکم ہے، جمہور مفسرین کے مطابق یہاں یہ اہم اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو افراد زیادہ اعتماد کے حامل ہیں وہ اگر اس اعتماد کی حق تلفی یا بے حرمتی کرتے ہیں یا اس کے نفاذ میں کوتاہی کرتے ہیں تو ان کے لیے مقرر کردہ مکافات بھی شدید تر ہیں۔

طبقہ دوم کے افراد سالہا سال کی محنت و مشقت کے بعد اور اپنے سرپرستوں کا کثیر سرمایہ صرف کر کے دنیاوی علوم وفنون پر دسترس حاصل کرتے ہیں، لیکن کلیتہً یہ طبقہ دنیا میں ایسا منہمک رہتا ہے کہ بنیادی عقائد سیکھنے اور اعمال و اخلاق درست کرنے کے لیے باضابطہ کتابیں نہیں پڑھی جاتی ہیں اور سرپرستوں و پڑوسیوں کی تقلید کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔زیادہ تر افراد فرائض وواجبات ادا کرنے کے صحیح طریقہ وضروری مسائل مستند کتابوں سے نہیں پڑھتے۔انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تلاوت کی اصلاح کر لیں اور قرآنی حروف کے مخارج وصفات اور حرکات کے طرز ادا کو بخوبی ذہن نشین کر لیں۔مادہ پرستی کے موجودہ دور میں جبکہ دین کی وہ قدر ومنزلت عوام کے دلوں میں باقی نہیں رہی جو پہلے تھی، جب عوام صرف دولت و دنیاوی وجاہت کو مطلوب حقیقی سمجھنے لگے ہیں، طبقہ دوم عوام پر زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے۔اس لحاظ سے ان افراد کی شرعی، تبلیغی اور اصلاحی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اور انھیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔موصوف واقف تھے کہ کوئی کام کسی سے کرنے کو کہنے سے پہلے اسے خود کرو، ساتھ ہی قرآنی ہدایت (16.90) کے مطابق عدل سے آگے بڑھ کے اپنے کو احسان کے دائرہ میں لے آنے کے لیے انھوں نے ’قرآن کریم کی بیسک ریڈر (رہنمائے تلاوت)‘ نامی کتاب کی تصنیف کی جسے پہلے کتب خانہ الفرقان نے شائع کیا اور اب اسے گاڈس گریس فاؤنڈیشن شائع کرتا ہے۔

کتاب کے پیش لفظ میں مولانا منظور نعمانیؒ نے سید صاحب کے متعلق تحریر کیا ہے کہ ”فن تجوید سے وہ صرف واقف ہی نہیں، بلکہ اس کے ماہر استاد تھے۔ان کے دل کی یہ خاص تڑپ اور لگن تھی کہ مسلمانوں میں قرآن پاک کی تلاوت صحیح طور پر کرنے کی ضرورت کا عام احساس ہو جائے اور اس کے لیے قواعد تجوید اور قرآنی الفاظ کے مخارج اور صفات وخصوصیات کے بارے میں جتنی واقفیت ضروری ہے، ہر تلاوت کرنے والا اتنی واقفیت حاصل کرنا ضروری سمجھے۔انھوں نے مزید لکھا کہ ’میں نے اس کتاب کا مطالعہ اصلاح کے ارادہ سے نہیں، بلکہ استفادہ کی نیت سے کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس مطالعہ سے مجھے فائدہ ہوا اور میں تلاوت کے سلسلہ کی اپنی بعض غلطیوں پر مطلع ہوا اور اصلاح وتصحیح کی توفیق ملی۔جو لوگ تجوید وقرأت کے کسی مدرسہ یا کسی استاد سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے مستقل وقت نہ نکال سکیں، ان کے لیے ممکن حد تک یہ کتاب ہی استاد اور مدرسہ بن سکتی ہے۔بعض اصطلاحات یا حروف والفاظ سمجھانے کے لیے ہندی اور انگریزی سے بھی کام لیا گیا ہے، اس فن پر اپنے طرز کی یقیناً یہ پہلی کتاب ہے‘۔معلوم ہوا کہ ملت کو اللہ کی آخری کتاب کا مکمل حق ادا کرنے کے لیے زیادہ کوشاں رہنا ہوگا۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

19.04.2018

No article published

Published in 26 Apr-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

اگلے انتخابات کے پیش نظر ہمارا نقشہ راہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”برسہابرس تک کثیر تعداد میں مسلمان حج کے لیے رقم جمع کرتے رہتے ہیں لیکن دنیا کا ہر مسلمان حج کرلے یہ اللہ کے نظام سے پرے ہے، پھر بھی تمنا اور تیاری تو ہم سب کو کرنی ہی چاہیے۔لہٰذا اگر یہ بھی خیال رہے کہ جمع کیے جانے کے دوران بھی یہ رقم کسی طرح ملت کے ضرورتمندوں کے کام آتی رہے تو حج کی مقبولیت میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔“

مستقبل قریب میں منعقد ہونے والے انتخابات میں ہمارا ووٹ نہ بٹے اس کے لیے طویل مدتی پلان فوراً شروع کردینا ہوگا،ہمیں اپنے سماج کو منظم کرنا ہوگا۔ہر انتخابی حلقہ میں ملت کے چند کیمیا گروں (علامہ اقبال کی اصطلاح : کچے تانبے کو سونے میں تبدیل کرنے والے لوگ) کو ملت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی، انھیں مستقل ملت کی فلاح کے کام کرکے اپنے انتخابی حلقہ میں مسلمانوں کا بھروسہ جیتنا ہوگا تاکہ الیکشن کے وقت عوام ان کی رائے پر جذبہ شوق سے توجہ دیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے کارگر نقشہ راہ یا روڈ میپ (Roadmap) یہ ہوگا کہ فکرمند خواتین و حضرات اپنے پارلیمانی یا اسمبلی انتخابی حلقہ پر توجہ مرکوز کریں اور اپنی طرح کے 8-10 دیگر بے لوث لوگوں کی شناخت کرکے انھیں اپنے ساتھ شامل کرلیں،اپنے گھر میں ایک باہری کمرہ کو دفتر بنالیں،ایک میز کرسی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ کا انتظام کر کے مردم شماری کے رجسٹرار جنرل (Registrar General of Census Operations) کی ویب سائٹ censusindia.gov.in پر جاکر اپنے انتخابی حلقہ میں کل آبادی، مسلم آبادی اور اس کا تناسب اور ہر گاؤں اور محلّہ کے اعداد وشمار معلوم کرلیں اس کا پرنٹ آؤٹ ایک دیوار پر لگائیں اور ایک فائل میں رکھیں۔

نیتی آیوگ کی ویب سائٹ niti.gov.in پر بہت سی نئی کارآمد اسکیمیں درج ہیں۔ مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کی ویب سائٹ minorityaffairs.gov.in پر اقلیتوں کے لیے متعدد اسکیموں کا تفصیلی ذکر ہے: کوچنگ پروگرام، اسکالرشپ اسکیم، فری کوچنگ اینڈ الائڈ اسکیم، گرانٹ اِن ایڈ اسکیم، ڈیولپمنٹ اینڈ فائنانس کارپوریشن، نئی روشنی برائے خواتین، ہنرمندی کے فروغ کے لیے ’سیکھو اور کماؤ‘ اسکیم، یو پی ایس سی اور صوبائی پبلک سروس کمیشن اور اسٹاف سلیکشن کمیشن کے ذریعہ منعقد پریلم امتحانوں میں کامیاب امیدواروں کے لیے امدادی اسکیم، ہائر تعلیمی اداروں کے اساتذہ کی مزید ٹریننگ کے لیے نالندہ اسکیم اور مائنارٹی سائبر گرام۔دوم، مرکزی ایچ آر ڈی منسٹری کی ویب سائٹ mhrd.gov.in پر ان اسکیموں کو بغور پڑھیں: سروشکشا ابھیان، مدارس میں کمپیوٹر و سائنس وغیرہ پڑھانے کی معقول امدادی اسکیم SPQEM، راشٹریہ مادھیمک شکشا ابھیان، لڑکیوں کے لیے سکنڈری تعلیمی اسکیم، قومی اسکالرشپ اسکیم، ہندوستانی زبانوں کے فروغ کی اسکیم، تعلیم بالغان اسکیم، لڑکیوں کے لیے ہاسٹل اسکیم، ماڈل اسکول اسکیم، سکنڈری تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کی اسکیم، ساکشر بھارت اسکیم، صوبائی ریسورس مرکز، جن شکشن سنستھان، سوم، نیشنل اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کی ویب سائٹ nsic.co.in پر جاکر قلیل مدتی ٹریننگ اور اس کے بعد حکومت کے ذریعہ مہیا کردہ مالی تعاون سے ضرورتمند لوگوں کو استفادہ کروائیں۔

مرکزی وقف کونسل کی ویب سائٹ centralwaqfcouncil.gov.in پر تین اسکیمیں دی ہوئی ہیں: آئی ٹی آئی، پیشہ ورانہ تعلیمی مرکز یا ووکیشنل ایجوکیشن سینٹر اور کتابوں کی فراہمی یا بک بینک و لائبریری۔ مرکزی وقف کونسل کی دیگر ویب سائٹ wamsi.nic.in پر جاکر اپنے حلقہ کی تمام وقف املاک کی مکمل معلومات حاصل کرلیں، اس کے بھی پرنٹ آؤٹ لے کر دیوار و فائل میں لگائیں۔ مقامی وقف جائداد میں خود جائیں، معلوم کریں متولی کون ہیں ان سے معلومات حاصل کریں، جائداد کی تصاویر اتاریں، وقف بیعنامہ کی نقل حاصل کریں اور اپنی ایک الگ فائل کھول کر اس میں لگائیں۔ اندازہ لگائیں کہ بیعنامہ کے اغراض ومقاصد کے مطابق وقف جائداد کا مکمل استعمال ہورہا ہے کہ نہیں اور جتنی آمدنی ہونی چاہیے اتنی ہو رہی ہے کہ نہیں۔کیا جائداد پر کوئی ناجائز قبضہ ہے، کیا مناسب حساب کتاب رکھا جارہاہے، کیا عدالت میں کوئی مقدمہ چل رہاہے، اس کی پیروی صحیح طور پر ہورہی ہے کہ نہیں، جائداد کا کرایہ موجودہ بازاری ریٹ پر آرہا ہے کہ نہیں۔اقلیتوں کے لیے وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام minorityaffairs.gov.in/prime-ministers-15points کے ہر نکتہ کو بغور پڑھیں اور جائزہ لیں کہ آپ کے انتخابی حلقہ میں ان میں سے ہر نکتہ کا کتنا نفاذ ہوا۔جن ایشوز پر نفاذ میں کمی رہی ہے، ان کے متعلق حق اطلاع قانون کے تحت معلومات کی جائے اور پھر افسران سے گفت وشنید کی جائے۔خاص طور پر اگر آپ کا انتخابی حلقہ شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہے جبکہ وہاں مسلمانوں کی تصدیق شدہ فیصد شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے تو پورا کیس تیار کرنا ہوگا اور طویل مدتی مہم چلانی ہوگی کہ آپ کے انتخابی حلقہ کو رزرویشن سے آزاد کیا جائے۔

ان سب اسکیموں کا گہرا مطالعہ کیا جائے، ان کے پرنٹ آؤٹ لیے جائیں، انھیں الگ الگ فائلوں میں رکھا جائے، ان کی نقلیں اپنے دفتر میں دیوار پر چسپاں کی جائیں، مختلف گاؤں اور محلوں میں ان لوگوں کی شناخت کی جائے جنھیں ان اسکیموں سے فائدہ پہنچنا چاہیے، درخواست کے فارم ڈاؤن لوڈ کر کے انھیں بھرنے میں ان کی مدد کی جائے اور ضروری دستاویز منسلک کرنے میں ان کی مدد کی جائے، ان مکمل فارموں کی نقل دفتر میں فائل میں رکھی جائے پھر انھیں اسپیڈ پوسٹ یا رجسٹرڈ پوسٹ سے متعلقہ افسر کو بھیجا جائے اور وہاں اس درخواست پر کیا کارروائی ہورہی ہے اس پر نظر رکھی جائے۔اسی طرح کی فلاحی اسکیموں کو صوبائی ویب سائٹوں سے بھی ڈاؤن لوڈ کیا جائے اور ان پر بھی یہی سب کارروائی کی جائے۔اگر صوبائی سطح کے کوئی خاص مسائل ہوں تو ان کی مکمل تحقیق کی جائے، ان سے متعلق تصدیق شدہ اعداد وشمار حاصل کیے جائیں اور ان سے متعلق صوبائی حکومت کو خطوط لکھے جائیں اور حکام سے ملاقات کر کے مسائل کے حل کے لیے ان پر زور ڈالا جائے۔آپ کے حلقہ میں قبرستانوں کی کیا حالت ہے؟ اگر ان کے گرد چہار دیواری نہیں ہے تو اس کے لیے تگ و دو کی جائے۔ آپ اپنے ذریعہ کی گئی تمام کارروائی کی اطلاع وقتاً فوقتاً میڈیا کو دیتے رہیں اور یقینی بنائیں کہ اس طرح اور دیگر ذرائع سے ساری معلومات آپ کے انتخابی حلقہ میں ملت کے افراد تک پہنچتی رہے۔

جمعہ کے ائمہ وخطیب صاحبان سے درخواست کی جائے کہ مقتدی صاحبان کو عربی خطبہ کے معنی اور مفہوم بھی سمجھائے جائیں۔ ایسا کرنے میں ان کی مدد کی جائے، ان سے جمعہ کے معیاری عربی خطبہ کی نقل لے کر ماہرین کے ذریعہ اس کا مقامی زبان میں تصدیق شدہ ترجمہ کروایا جائے اور ائمہ و خطیب صاحبان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ان سے یہ بھی درخواست کی جائے کہ جمعہ کے دن کی جانے والی مقامی زبان میں تقریر کے عنوان بھی پہلے سے پلان کر لیے جائیں اور تقریر کا مواد تحقیق کر کے تیار کرلیا جائے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے پروفیسر سعود عالم قاسمی کی کتاب ’خطبات جمعہ، امام وخطیب صاحبان کو پیش کی جاسکتی ہے۔امام یا خطیب صاحب کا پتہ اور مسجد کا نام naseemmajeed@gmail.com پر بھیجنے سے یہ کتاب ان تک ڈاک سے پہنچ جاتی ہے۔اپنے محلّہ کی مسجد کے متولی صاحب اور اراکین کمیٹی کی توجہ دلوا کر وہاں ایک کمرہ میں، نماز کے اوقات کے علاوہ، دارالمطالعہ و مرکز اطلاعات شروع کیا جاسکتا ہے۔ برسہابرس تک کثیر تعداد میں مسلمان حج کے لیے رقم جمع کرتے رہتے ہیں لیکن دنیا کا ہر مسلمان حج کر لے یہ اللہ کے نظام سے پرے ہے، پھر بھی تمنا اور تیاری تو ہم سب کو کرنی ہی چاہیے۔لہٰذا اگر یہ بھی خیال رہے کہ جمع کیے جانے کے دوران بھی یہ رقم کسی طرح ملت کے ضرورتمندوں کے کام آتی رہے تو حج کی مقبولیت میں چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اپنے انتخابی حلقہ کے لوگوں میں خصوصاً نوجوانوں میں ملی جذبہ کے فروغ کی غرض سے علامہ اقبال کے کلام میں ان کا شوق پیدا کرنا کافی کارآمد ہوگا۔ جیسے پیام عشق میں وہ کہتے ہیں کہ اب ملت سے بے نیازی ذاتی طور پر بھی نقصان دہ ہوگی، آپ کو ملت کے لیے روشن شمع کی طرح دنیا میں رہنا ہوگا:

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نوردیوں کا
جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں میانِ محفل گداز ہوجا

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 03 May-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

سول سروسز: ملت کی زرخیز مٹی کو نم کرنا ہے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سول سروسز میں مسلمانوں کی نمائندگی 3-2.5 فیصد پر منجمد رہنے کا طلسم ٹوٹ گیا اور اب یہ ہندسہ 5 سے تجاوز کر گیا ہے۔ لگاتار دو برس 50 سے زائد مسلمانوں کے سول سروسز میں کامیابی سے لگتا ہے کہ گزشتہ دس برس کے دوران ٹی وی و ریڈیو پر مثبت گفتگو، اخبار و پورٹلوں پر مختلف زبانوں میں شائع مضامین، دہلی، الٰہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ، رامپور، دہرہ دون، بستی، بہرائچ، سری نگر، بھوپال، حیدرآباد، ممبئی، پونہ، ناگپور، اورنگ آباد، امراوتی، پٹنہ، رانچی، احمد آباد، بنگلور، منگلور، بھٹکل، چنئی، کوچین، ملاپورم، ترونت پورم، کلکتہ، گوہاٹی، بھوبنیشور، جے پور، الور، ٹونک، میوات یعنی 33 مقامات پر سول سروسز اورینٹیشن پروگراموں (Civil Services Orientation Programs) میں ایک ایک گھنٹے کے پاور پوائنٹ پرزنٹیشن کے ذریعہ دسیوں ہزار گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ مسلم نوجوانوں سے خطاب کرنے، ان کے سوالوں کے جواب دینے اور ان میں سے چنندہ قابل ترین امیدواروں کو مطمئن کر کے انھیں دہلی میں ملک کے کامیاب ترین سول سروس اداروں میں کوچنگ کروانے کا اثر الحمدللہ شروع ہو گیا۔ قابل تحسین ہیں متعدد تنظیمیں و ادارے جن کے ذریعہ سول سروسز سے متعلق سہولتیں قائم کی گئیں۔ لیکن ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا اور ان تازہ ترین نتائج کی بنا پر ہمیں آسودہ خاطر (Complacent) نہیں ہو جانا چاہیے۔ مردم شماری 2011 کے مطابق ملک میں مسلمان 14.2 فیصد ہیں، لہٰذا اتنا تناسب تو ہمارا ہونا ہی چاہیے سول سروسز میں۔ اس کے لیے ہمیں گزشتہ دس برس میں اب تک کی گئی محنت کی تین گنا تگ و دو شروع کر دینی ہوگی۔

سب سے اہم ایشو ہے قابل ترین لڑکوں اور لڑکیوں کی شناخت کر کے ان تک پہنچنا اور انھیں سول سروسز کے امتحان میں مضبوط امیدوار بن کر شمولیت کی غرض سے معقول تیاری کرنے کے لیے قائل کرنا۔ 1993 میں ناگپور میں تعیناتی پر میں نے وہاں پروفیسر صاحبان و ملت کے دیگر دانشور و فعال طبقہ سے رجوع کیا، معلوم ہوا کہ مومن پورہ نام کا بہت بڑا محلّہ ہے اور اس برس ناگپور یونیورسٹی میں جو طالب علم ایل ایل بی میں پہلے نمبر پر آیا تھا، اس کا نام تھا مصطفیٰ لیکن آزادی کے بعد سے اُس وقت تک ناگپور سے ایک بھی مسلمان نے مقابلہ کے کسی امتحان میں حصہ لیا ہی نہیں تھا۔ مقامی اہل فکر کی امداد سے 12-10 قابل ترین گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ طلبا و طالبات کی شناخت کی گئی، انجمن اسکول میں ایک کمرہ لیا گیا، منتخب بچوں کے گھروں پر روز مغرب بعد پورے گروپ نے جا کر ان سے اور ان کے والدین سے گفتگو شروع کی اور ان سے اپیل کی کہ وہ اتوار کے روز انجمن اسکول آئیں تا کہ ان سے مقابلہ جاتی امتحانات سے متعلق مزید مکالمہ کیا جائے، اور انھیں مواد مہیا کیا جائے۔ سات ہفتوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن کوئی بچہ انجمن اسکول کسی بھی اتوار کو نہیں آیا، لیکن ہم لوگ آٹھویں ہفتہ بھی بعد مغرب ان کے گھروں میں گئے، اس طرح آٹھویں اتوار سے بچے انجمن اسکول آنا شروع ہو گئے۔ دو برس کے اختتام تک ایک بچی یو پی ایس سی کی سول سروس میں اور ایک بچہ مہاراشٹر کی صوبائی ایڈمنسٹریٹو سروس میں کامیاب ہو چکے تھے، یقین مانئے ملت کی مٹی زرخیز ہے بس اسے ذرا نم کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کا کام اخلاص و یکسوئی سے صحیح طرز پر محنت کئے جانا ہے اور اس کاوش میں اثر ڈالنا اللہ کا ہی کام ہے۔

”سچر کمیٹی نے اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ تو بتایا ہے کہ مسلمان تعلیمی، اقتصادی اور سماجی میدانوں میں بشمول شیڈولڈ کاسٹ کے سب سے کافی پیچھے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی بڑی وجہ ہے ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی معمولی نمائندگی۔ لہٰذا اکابر ملت نے طے کیا کہ اس عظیم کام کا بیڑا خود ہی اٹھانا ہوگا۔“

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے شروع میں چودھری محمد عارف، چودھری طیب حسین، سید حامد، شفیع قریشی اور حکیم عبدالحمید مرحومین کی جدوجہد سے دہلی کے لودھی روڈ پر مرکزی حکومت نے پونے دو ایکڑ زمین الاٹ کر دی تھی جس پر دو پرانی بوسیدہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں، انھیں میں ملک بھر سے کسی بھی سرکاری ملازمت میں ذرا بھی دلچسپی دکھانے والے کسی بھی طالب علم کو عارف بھائی ٹھہرنے کی اجازت دے دیتے تھے اور ہم جیسے کچھ لوگوں کو ادھر اُدھر سے بلا کے کبھی کبھی لکچر بھی کروا دیا کرتے تھے۔ ان کے اسی جتن سے اگلی دو دہائیوں میں سو سے زائد بچوں کو ملک کی چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتیں جوائن کرنے میں کافی مدد ملی۔ زمین کے اس خطہ پر جو انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر قائم ہونا تھا اس کا بنیادی مقصد تھا سول سروسز میں ملت کے بچوں کو پہنچانے کے لیے ادارہ ساز اقدام کرنا، لیکن اکیسویں صدی کے شروع میں سینٹر کی عمارت مکمل ہونے کے بعد وہ بنیادی کام پروان نہیں چڑھ سکا۔ لیکن ساتھ ہی بیسویں صدی کی آخری دہائی کے شروع میں ہی حکیم عبدالحمید اور سید حامد مرحومین کی مشترکہ دوراندیشی و زمینی کارکردگی سے دہلی کے تغلق آباد علاقہ میں پچاس کمروں پر مشتمل ہمدرد اسٹڈی سینٹر قائم ہو گیا تھا اور اس میں ملک بھر سے سول سروسز میں دلچسپی رکھنے والے 50 طلبا سال بہ سال یکجا کئے جانے لگے۔ اس سے یہ ہوا کہ ہر سال یو پی ایس سی کے ذریعہ سلیکٹ کئے جانے والے افسران کی کل ہند تعداد میں بتدریج اضافہ کے باوجود سول سروسز میں مسلمانوں کا فیصد 3-2.5 سے کم نہیں ہوا اور قائم رہا۔ مشہور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی آیت 2.284 کے تحت فرماتے ہیں کہ مغفرت ہوگی تو قانون رحمت عامہ کے مطابق اور عذاب ہوگا تو قانون حکمت کاملہ کے ماتحت۔ جسٹس راجندر سچر انسانیت کو کروڑوں کے مقابلے میں زیادہ دے کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے، انھیں مکمل احساس تھا کہ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے۔ سچر کمیٹی نے اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ تو بتایا ہے کہ مسلمان تعلیمی، اقتصادی اور سماجی میدانوں میں بشمول شیڈولڈ کاسٹ کے سب سے کافی پیچھے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کی بڑی وجہ ہے ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی معمولی نمائندگی۔ لہٰذا اکابر ملت نے طے کیا کہ اس عظیم کام کا بیڑا خود ہی اٹھانا ہوگا۔ 2008 میں دہلی میں سرسید کوچنگ اینڈ گائڈنس سینٹر فار سول سروسز قائم کر دیا گیا جس کے نتائج میں سال بہ سال الحمدللہ بہتری آتی جا رہی ہے۔ یاد رکھئے کہ سول سروسز کی کوچنگ کے لیے سب سے کامیاب ادارے دہلی میں ہی ہیں۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کی مولانا آزاد نیشنل اوپن یونیورسٹی، جے پور کی جامعہ ہدایت، ممبئی کی مرکزی حج کمیٹی اور چنئی کی مرکزی جامع مسجد میں بھی سول سروسز کی کوچنگ کا کام شروع ہوا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حکومت کی مدد سے اقلیتوں اور شیڈولڈ کاسٹ کے امیدواروں کے لیے کوچنگ کا انتظام ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رہائشی کوچنگ اکیڈمی (Residential Coaching Academy) ہونے کے باوجود وہاں سے حال کے برسوں میں سول سروس کے میدان میں خاطر خواہ کامیابی دکھائی نہیں پڑی ہے موجودہ وی سی پروفیسر طارق منصور اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ پورے ملک میں سول سروسز کی تیاری میں دلچسپی لینے والے بچوں میں لڑکیوں کا فیصد بہت کم ہے، اس ایشو پر بھی بچیوں کو، ان کے والدین کو اور دیگر خواتین و حضرات کو توجہ دینی ہوگی۔ بقول اقبالؔ:

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 10 May-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

نماز کیلئے تنگیٔ داماں بنام مرکزی وقف کونسل

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”ہریانہ و دیگر صوبوں میں بھی افراد ملت اگر چاہیں چمنستان کی ہیئت بدل سکتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کے علاوہ بھی بہت سے سرکاری محکموں اوران کے ماتحت ایجنسیوں نے وقف املاک پرناجائز قبضہ کررکھا ہے جس کے لیے مختلف صوبوں واضلاع میں ملت کومتحرک ہونا پڑے گا۔“

ہریانہ وقف بورڈ نے صوبائی حکومت کو گڑگاؤں میں 19 ایسی وقف املاک کی فہرست سونپی ہے جہاں نماز اس وجہ سے نہیں ہورہی ہے کیونکہ یا تو مقامی افراد وہاں عبادت کی مخالفت کرتے ہیں یا ان املاک پر ناجائز قبضہ ہے۔ چونکہ وہاں حال میں سنگھ پریوار کے افراد نے چند مقامات پرسڑکوں پرنماز جمعہ کے پڑھے جانے پر احتجاج کیا ہے، اس لیے صوبائی وقف بورڈ نے یہ اقدام کیا ہے۔ وزیراعلیٰ نے کہا ہے کہ اگر سڑک پر نماز پڑھنے پر کچھ لوگوں کو شکایت ہے تو اس پر دھیان دینا ہی ہوگا، یہ بالکل درست ہے لیکن اوقاف کی زمین جائیداد مسلمانوں کی ہیں، وہاں وہ نماز پڑھ سکتے ہیں، وہاں انھیں عبادت کرنے میں اگرکوئی دقت پیدا کرے تو اس پر بھی وزیراعلیٰ کو اتنا ہی دھیان دینا ہوگا۔ وقف بورڈ نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر ان زمینوں پر عبادت گاہیں بنانے کی ضرورت ہے تو اس کے لیے بھی بورڈ تیار ہے۔ پالم وہار کے چوما گاؤں میں دو ایکڑ وقف زمین صوبائی حکومت نے ایکوائر کرلی ہے، جس پر ہائی کورٹ نے حکم دیا ہے کہ اس کی متبادل زمین وقف بورڈ کو دی جائے، یہ کام بھی ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ وزیرآباد، دولت پور، نصیرآباد، دھنکوٹ، میوکا اور گڑھی ہرسارو میں بھی مساجد میں نماز نہیں ہو رہی ہے، کیونکہ مقامی سنگھیوں کو اس پر اعتراض ہے۔ جھرسا، فاضل پور، نورنگ پور اور میوکا میں وقف بورڈ کی زمین پر مسجدیں بنانے میں بھی زعفرانی عناصر اڑچنیں پیدا کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ان وقف جائدادوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو مسجد، مقبرے وغیرہ ہیں لیکن وہ محکمہ آثارقدیمہ کی تحویل میں ہیں جس نے وہاں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے حالانکہ یہ اجازت نہ دینا بھی غیر قانونی ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں اس وجہ سے کوئی جائداد دی جاتی ہے، تاکہ وہ اس کی مکمل دیکھ بھال کرے اور اسے قائم ودائم رکھے، لیکن دراصل یہ کام نہیں ہوتا ہے اوریہ وقف جائدادیں سرکاری لاپروائی کا اس قدر شکار رہتی ہیں کہ اس پرناجائز قبضے ہونے لگتے ہیں جس کی محکمہ آثارقدیمہ اندیکھی کیے رہتا ہے، ان مساجد ومقبروں کی بے حرمتی بھی خوب ہی ہوتی ہے۔ اسی لیے سچر کمیٹی نے کہا تھا کہ ہر تین ماہ پر محکمہ آثار قدیمہ (Archeological Survey of India) و مرکزی وقف کونسل کے افسران کی مشترکہ مشاورتی میٹنگ ہونی چاہیے، محکمہ آثارقدیمہ کی زیرتحویل وقف جائدادوں کی حالت پرتبصرے کیے جانے چاہئیں اور جو وقف جائدادیں محکمہ سے نہیں سنبھل رہی ہیں، ان کو اس کی تحویل سے خارج کرکے وقف بورڈ کی تحویل میں واپس کردیا جانا چاہیے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد 08-2007 میں دو تین میٹنگیں ہوئیں جن میں کوئی خاص اہم تبادلہ خیال نہیں ہوا اور اس کے بعد سے تو وہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ دراصل یہاں سچر کمیٹی کی ایک اہم سفارش کے نفاذ نہ ہونے سے اوقاف خسارہ میں ہیں۔ سچر رپورٹ کے پیرا 4.1 میں صفحہ 229 پر کہا گیا ہے کہ مرکزی وقف کونسل کے سکریٹری کا سرکاری رتبہ مرکزی حکومت کے جوائنٹ سکریٹری سے کم نہیں ہونا چاہیے، تاکہ مرکزی وقف کونسل کی وزارتوں ودیگر سینئر سرکاری افسروں کے ہمراہ، ہم پلہ رہ کر بامعنی گفت وشنید، خط وکتابت اور رکھ رکھاؤ قائم ہوسکے۔

اس امر کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ پورے ملک میں سول سروسز کا ایک مضبوط جال بچھا ہوا ہے اور ہر سطح پر 90 فیصد سے زیادہ حکومت اعلیٰ افسر ہی چلاتے ہیں، اگر اسی افسرشاہی کا ایک مسلم رکن مرکزی وقف کونسل کا سکریٹری بھی رہے گا تو مرکزی و صوبائی حکومتوں اور ضلع کلکٹروں کے ذہنوں میں اوقاف کے کام کے لیے جگہ بڑھ جانے سے ان کے تئیں منفی پہلو وسرد مہری کم ہو جائے گی۔ یاد رہے کہ وارانسی کے کاشی وشوناتھ مندر سے متعلق صوبائی قانون کے مطابق یوپی حکومت کے چار پرنسپل سکریٹری، ثقافتی امور کا ڈائریکٹر، وارانسی کا ڈویژنل کمشنر اور ضلع مجسٹریٹ مندر کا انتظام کرتے ہیں۔ کرناٹک کے ہندو مذہبی ادارے و رفاہی بندوبست قانون کے تحت ساری ذمہ داری اس کمشنر کی ہے جو اس کام کے لیے تعینات کیا جائے اور سیکشن 3 کے تحت اس کا آئی اے ایس افسر ہونا اور سیکشن 7 کے تحت اس کا ہندو ہونا ضروری ہے۔ آندھراپردیش کے متعلقہ قانون کے سیکشن 4 کے تحت وہی شخص کمشنر بن سکتا ہے جو کسی ضلع کا کلکٹر رہ چکا ہو اور تعیناتی کے وقت بھی کلکٹر کی سطح سے کم کا افسر نہ ہو اور سیکشن (2)3 کی رو سے اس کا ہندو ہونا ضروری ہے۔ تمل ناڈو کے قانون کے سیکشن 9 و 10 کے تحت اس کمشنر کا اعلیٰ جوڈیشیل سروس یا اس کے برابر کی دیگر سروس کا اور ہندو ہونا ضروری ہے۔ کیرالہ میں سیکشن 8C کے تحت ملبار دیوسم بورڈ کا کمشنر وہی ہندو بن سکتا ہے جس کا رتبہ صوبائی حکومت میں جوائنٹ سکریٹری سے کم کا نہ ہو۔ اسی طرح غور کریں کہ اگر مرکزی وقف کونسل کے سکریٹری کا رتبہ حکومت ہند کے جوائنٹ سکریٹری کی سطح کا کردیا گیا ہوتا تو محکمہ آثار قدیمہ کے ساتھ میٹنگوں کا سلسلہ بند نہیں ہوتا اور ہر میٹنگ میں مرکزی وقف کونسل کا پلہ بھاری رہتا اور ان میٹنگوں کی روداد کونسل کی طرف سے سرکاری نظام مراتب میں اونچی سطح سے تحریر کی جاتی اور میٹنگوں میں لیے گئے فیصلوں کے نفاذ کو کونسل مضبوطی سے یقینی بناسکتی تھی اور اس طرح پورے ملک میں نظام اوقاف پر بھی اس طریق کار کا زبردست مثبت اثر پڑے گا۔ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کو اس بابت توجہ دینی چاہیے۔ دوسری طرف کیونکہ مرکزی وقف کونسل کے چیئرمین وزیر موصوف خود ہوتے ہیں جن کے پاس ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے روز آٹھ گھنٹے کا وقت نہیں ہے، لہٰذا اگر وہ کونسل کے ایک سینئر رکن (سچر کمیٹی کے مطابق ترجیحاً سابق ہائی کورٹ جج) کو اس کام کے لیے کل وقتی ورکنگ پریسیڈنٹ متعین کرکے اسے وزیرمملکت کا درجہ دلوادیں تو اوقاف کا کام ڈھرّے پر لگنے میں بہت مدد ملے گی۔ ساتھ ہی افراد ملت کو بھی نظر رکھنی ہوگی اور جن وقف املاک کو محکمہ آثارقدیمہ اپنی لاپروائی کا شکار بنائے ہوئے ہے، ان کی وقف بورڈ کو واپسی اور ان کی بازآبادکاری کے لیے ضروری تگ ودو ملت کو کرنی ہوگی۔ کرناٹک میں ایک سول کنٹریکٹر نے درجنوں وقف جائدادوں کو ناجائز قبضوں سے رہا کرواکے وہاں دوبارہ نماز باجماعت شروع کروائی ہے۔ ہریانہ ودیگر صوبوں میں بھی افراد ملت اگر چاہیں چمنستان کی ہیئت بدل سکتے ہیں۔ محکمہ آثارقدیمہ کے علاوہ بھی بہت سے سرکاری محکموں اور ان کے ماتحت ایجنسیوں نے وقف املاک پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے جس کے لیے مختلف صوبوں واضلاع میں ملت کو متحرک ہونا پڑے گا۔

ادھر دہلی میں مرکزی وزارت شہری نشوونما کے لینڈ ڈیولپمنٹ افسر نے 25/فروری 2017 کو سی جی او کمپلیکس سے متصل دو خطوں میں 2.23 ایکڑ وقف زمین وزارت داخلہ کو الاٹ کردی اور اس کے عوض میں 49,06,000 روپے کی رقم خود حاصل کرکے 22/مارچ 2017 کو قبضہ دے دیا، تاکہ وہاں مرکزی ریزرو پولیس فورس کے دفاتر، بیرک و کینٹین اور پارکنگ بنائی جائے۔ الاٹمنٹ کے آرڈر میں یہ شرط بھی لکھی گئی کہ اس زمین پر موجود مسجد و قبروں سے متعلق 2011 میں دائر شدہ سول مقدمہ نمبر 397 حبیب الرحمٰن بنام مرکزی حکومت کی سی آر پی ایف کو خود ہی پیروی کرنی ہوگی۔ آرڈر میں یہ بھی لکھا گیا کہ زمین کے ان دوخطوں سے متصل ایک تیسرا خطہ بھی سی آر پی ایف کو الاٹ کردیا جائے گا جس کے لیے علیحدہ درخواست دینی ہوگی۔ اس کے بعد 20/جولائی 2017 کو دہلی وقف بورڈ نے تھانہ نظام الدین کے ایس ایچ او کے دفتر میں درخواست پیش کی کہ مندرجہ بالا زمینی خطے حکومت دہلی کے سرکاری گزٹ بتاریخ 31/دسمبر 1970 میں قبرستان اور لال مسجد کی حیثیت سے خسرہ نمبر 360 و 361 کے تحت نوٹیفائیڈ ہیں۔ مزید یہ کہ اس وقف جائداد پر چند سرکاری افسر بیجا مداخلت کررہے ہیں اور ان کے ذریعہ کیے جانے والی ناجائز کارروائی کو روکا جائے۔ اس خط کی نقل ایس ڈی ایم ڈیفنس کالونی، پرانی گرگی کالج بلڈنگ، لاجپت نگر IV کو اور ڈپٹی پولیس کمشنر، سریتا وہار کو بھی دی گئی۔ اہل دہلی کو اس معاملہ میں دلچسپی لے کر اس قیمتی وقف جائداد کو مرکزی حکومت کے ذریعہ ناجائز قبضہ سے آزاد کروانا ہوگا۔

❒❖❒

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 17 May-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

> ”ہندوستان میں آنے والے تارکین وطن و پناہ گزینوں کے ساتھ بر تاؤ کی پالیسی میں آپ کی حکومت کے ذریعہ مذہب کی بنیاد پر بظاہر دھرا برتاؤ ہمارے ملک عزیز کے دیرینہ رہنما اصول ’ایکم ست وِپراہ بھودہ‘ سے تغیر پذیر نظر آتا ہے اور یہ 2016 کے نیو یارک اعلامیہ برائے تارکین وطن و پناہ گزیں سے بھی مناسبت نہیں رکھتا ہے حالانکہ اس اعلامیہ کی مسودہ نویسی و اس کے اجرا کے دوران آپ کے وزیر مملکت برائے خارجی امور نیو یارک میں موجود تھے۔“

محترم وزیراعظم صاحب! آپ کو یاد ہوگا کہ 29 جون 2013 کو گاندھی نگر احمد آباد میں ’ایک بھارت شریشٹھ بھارت‘ مکالمہ کے دوران آپ کے سامنے میں نے ایک پاور پوائنٹ پرزنٹیشن پیش کیا تھا جس میں زیر تبصرہ ایشوز پر بعد میں دو خطوط کے ذریعہ آپ کو یاد دہانی بھی کی۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے مشوروں میں سے چند پر آنجناب نے مثبت توجہ فرماتے ہوئے انھیں اپنی پارٹی و حکومت کی پالیسیوں میں شامل کرلیا مثلاً بی جے پی کی ویب سائٹ پر مسلم محبت مضمون اپلوڈ کرنا اور ہنرمندی پر سرکاری زور دینا اور سماج میں اس کی مناسب پہچان بنانے کی کوشش کرنا۔ ہم مسلمان اس لیے بھی آپ کے شکرگزار ہیں کہ 2014 میں پارلیمنٹ میں اپنے پہلے خطاب میں آپ نے مسلمانوں کی عمومی بدحالی کے تئیں فیاضانہ کلام کیا تھا‘ اسی برس سی این این کے فرید ذکریا سے گفتگو کے دوران آپ نے ملت اسلامیہ ہند کے بارے میں اچھے تاثرات دئے اور ابھی فروری 2018 میں آپ نے شاہ اردن کے سامنے نئی دہلی کے وگیان بھون میں اسلام دوست تقریر کی۔ ان سب خاطر خواہ بیانات کے باوجود ہمارے ملک میں یہ تاثر بنا ہوا ہے کہ حال کے برسوں میں بنے ہوے ماحول کی وجہ سے مسلمانوں کو نشانہ بنانا نامساعد قومی ثقافت کا حصہ ہو گیا ہے۔ وقتاً فوقتاً مختلف سطحوں پر‘ پارٹی و حکومت کے کسی عہدہ دار‘ سنگھ پریوار‘ انفرادی سرگرم کارکن کے ذریعہ کوئی نہ کوئی بیان یا اشارہ آتا رہتا ہے جس سے مسلم مفاد مجروح ہوتا ہے۔ اسی طرح کے ایک سنگین مجرمانہ بیان کی وجہ سے 2016 میں آپ کے ذریعہ ایک مقرر کو وزارتی کونسل سے برخاست بھی کیا گیا جس کے لیے ہم آپ کے ممنون ہیں۔

لیکن دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار کے تواتر کے خلاف آپ کی حکومت کی سپریم کورٹ کے سامنے پہلو تہی تمام منطق کو للکار رہی ہے۔ دستور ہند یا کسی بھی قانون میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ اگر اقلیتیں اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور بعد میں ان اداروں کے سرکاری رکگنیشن کے لیے ضرورتاً کوئی انتظامی یا قانونی کارگزاری کرنی پڑے تو اس کی وجہ سے اس ادارہ کا اقلیتی کردار خطرہ میں پڑ جائے گا۔ جناب‘ آپ کو معلوم ہے کہ وقف اسلام کا مذہبی معاملہ ہے۔ لیکن 2014 کے وقف املاک سے ناجائز قبضہ خالی کروانے کے بل سے متعلق آپ کی حکومت کے ذریعہ بنائی گئی اسٹینڈنگ کمیٹی کے 29 ممبروں میں سے صرف 2 ممبر مسلمان ہیں۔ اس کمیٹی نے متعلقہ وزارت کی افسرشاہی کے ذریعہ پیش کیے گئے مدلل نکتوں کو بغیر وجہ بتائے ہوئے خارج کردیا اور اوقاف کے مفاد کو مجروح کرنے والی سفارشیں بھی کی ہیں۔ ملک میں متعدد مقامات پر چنندہ مسلم افراد کے ساتھ بھیڑ نے بدسلوکی کی اور کئی جگہ اس فرد کا قتل بھی کردیا گیا بلکہ قاتل کے لیے تہنیتی جلوس بھی نکالا گیا۔ فروری 2017 میں یوپی الیکشن کے دوران آپ کی تقریر میں شمشان کو قبرستان کے برعکس صف آرا کیے جانے سے قبل زمینی حقائق و اعداد و شمار کا جامع جائزہ لیا جانا ضروری تھا۔ قبرستان کی ہزاروں وقف املاک پر ناجائز قبضے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں‘ اشد ضروری ہے کہ ان قبضوں کو ہٹایا جائے اور وقف جائدادوں کی محافظت کی جائے جبکہ ایسا کوئی ایشو شمشان سے متعلق عوام کی دانست میں نہیں ہے۔

طلاق ثلاثہ کے بارے میں آپ کی تشویش قابل قدر ہے لیکن اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس کے لیے مجوزہ تعذیری قانون سے جن خواتین کو فائدہ ہو سکے گا ان کی تعداد قلیل ترین ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ انڈین وقف سروس قائم کردیں (جس کی سفارش سچر کمیٹی نے کی لیکن یہ سفارش یوپی اے حکومت کے دوران اندرونی لاپروائی کی بنا پر خارج ہو گئی‘ پھر میں نے جون 2013 میں اور اس کے بعد بھی اس بابت آپ کی توجہ مبذول کی) تو یہ کارروائی لاکھوں وقف املاک کی ناجائز قبضہ سے نجات و ان کے تحفظ کا ذریعہ بنے گی اور اس اقدام سے آپ کو مسلمانوں کی احسان مندی حاصل ہوگی۔ حال میں نیتی آیوگ نے ملک کے بیکورڈ ترین اضلاع کی فہرست جاری کی ہے جس میں مسلمانوں کے غلبہ والے ضلعوں کی تعداد کسی بھی دوسری برتری والے اضلاع سے زیادہ ہے‘ اور مسلم تسلط والے اضلاع اس فہرست کے اول ترین ناموں میں سے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے متعدد سرکاروں کے دوران دسیوں برس کی غفلت برتنے و دانستہ طور پر ان اضلاع کی ترقی کو نظرانداز کیے جانے کا آپ کی حکومت میں ان اضلاع میں مسلم حقوق کی بازیابی کے لیے جلد ضروری کارروائی مسلمانوں کی خوشی کا باعث ہوسکے گی۔ جہاد کا مفہوم ہے فرد کے ذریعہ اپنے اندر اعلیٰ اخلاقی اقدار سرایت کرنے کی تگ و دو کرنا تا کہ فرد سماج کی فلاح کے لیے بہتر انسان بن سکے‘ یہ اسلامی دینی تہذیب کا بنیادی جز ہے۔ لیکن حال کے برسوں میں ہمارے ملک عزیز میں جہاد کے ساتھ منفی پالیسی جوڑنے کا رجحان بن گیا ہے اور اس کے لیے اس پاک تصور کے ساتھ سیاسی ترغیب والی شاطرانہ صفات شامل کی جاتی ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں یہ حرکت جان بوجھ کر کی جارہی ہے خاص کر مسلمانوں کے ذریعہ دستور ہند کے مطابق اپنے کو ادارہ ساز طریقہ سے تعلیمی‘ اقتصادی و سماجی سطح پر بہتر بنانے کے لیے تنظیمی چارہ جوئی کو بھی جہاد کی بگاڑی ہوئی تصویر کے ساتھ منسوب کیا جارہا ہے اور ایسی شرارت کرنے والوں کے ذریعہ تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ انھیں آپ کی پارٹی یا حکومت کی حمایت حاصل ہے‘ اس تاثر کو ختم کیا جانا چاہیے۔

ہندوستان میں آنے والے تارکین وطن و پناہ گزینوں کے ساتھ برتاؤ کی پالیسی میں آپ کی حکومت کے ذریعہ مذہب کی بنیاد پر بظاہر دہرا برتاؤ ہمارے ملک عزیز کے دیرینہ رہنما اصول ’ایکم ست وِپراہ بہودہ‘ سے تغیر پذیر نظر آتا ہے اور یہ 2016 کے نیو یارک اعلامیہ برائے تارکین وطن و پناہ گزیں سے بھی مناسبت نہیں رکھتا ہے حالانکہ اس اعلامیہ کی مسودہ نویسی و اس کے اجرا کے دوران آپ کے وزیر مملکت برائے خارجی امور نیو یارک میں موجود تھے۔ جناب عالی‘ ملک کے مسلمان کسی سیاسی گروپ کے مرہون منت نہیں ہیں۔ وہ اس گروپ کی طرف مائل ہوں گے جو ان کے سماجی‘ اقتصادی و تعلیمی سطح کو اونچا اٹھانے میں مددگار ثابت ہو۔ آپ کی پارٹی کے منشور میں لکھا تھا کہ مختلف مذہبی فرقوں کے مابین محبت و اخوت قائم کرنے کی غرض سے ایک بین المذاہب ہم آہنگی تنظیم قائم کی جائے گی‘ ملک کے عوام اس تنظیم کی تشکیل و کارکردگی کی بھی راہ دیکھ رہے ہیں۔ اگر سیاسی مفاد اور انسانی مفاد میں تصادم ہو تو یقیناً انسانی مفاد کو برتری ملنی چاہیے۔ آیئے ہم سب مل کے 2118‘ 2218 اور 2318 کے ہندوستان کا تصور کریں اور اس تصویر میں ابھی سے مثبت اعمال کے ذریعہ یکجہتی‘ ترقی و بھائی چارہ کا رنگ بھریں اور یہی پیغام ہم تمام ہندوستانی عوام کو دیں۔ بقول ڈاکٹر سر محمد اقبال ہم ایک ایسا شوالا بنائیں جس کے لیے کہا جائے:

شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

❏❖❏

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 24 May-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

غیر جانبدار سول سروسز میں حکومت کی دست درازی

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”جمہوریت کی مضبوطی کے لیے خودمختار سول سروس ایک اہم جز ہے،لیکن اگر وزیراعظم کے دفتر کی تاکید کا نفاذ ہوگیا تو یو پی ایس سی کے ذریعہ اعلان شدہ میرٹ لسٹ کا وقار خطرہ میں پڑ جائے گا۔اب سروس جوائن کرنے کے بعد ہونے والے فاؤنڈیشن کورس میں نئے متعین افسر کی کارکردگی کی قدر پیمائی کے نام میں یو پی ایس سی کی میرٹ لسٹ کے ساتھ دست درازی کی جائے گی۔ایسا کرنے سے ہمارے دستور کے آرٹیکل309,311,312A کی روح مجروح ہوتی ہے۔“

مرکزی حکومت کے سرکاری عملے کے امور کے لیے محکمہ (Department of Personnel & Training:DoPT)کے انچارج ہمیشہ وزیراعظم خود ہی ہوتے ہیں، یو پی ایس سی اسی کے تحت آتا ہے۔اس وزارت کے جوائنٹ سکریٹری وجے کمار سنگھ نے 17رمئی 2018 کو تمام وزارتوں ومحکموں کو ایک خط بھیجا، جس میں انھوں نے یاددلایا کہ سول سروسز میں کامیابی کے بعدلال بہادر شاستری قومی اکیڈمی برائے انتظامیہ،مسوری و دیگر مقامات پر اسی طرح کی سول سروسز اکیڈمیوں میں فاؤنڈیشن کورس (Foundation Course)یعنی بنیادی نصاب کے مطابق 4 ماہ کی ٹریننگ شروع ہونے سے قبل ہی سول سروسز کے نئے افسروں کے لیے سروس کا تعین اوران کی صوبہ وار جمعیت کا تعین (Service and Cadre Allocation) یو پی ایس سی کے امتحان میں ان کے ذریعہ حاصل کی گئی میرٹ کے مطابق طے کر کے اس کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ وجے کمار سنگھ نے آگے لکھا کہ اب موجودہ وزیراعظم کے دفتر نے کہا ہے کہ یہ سروس الوکیشن اور کیڈر الوکیشن فی الحال ملتوی کر دیا جائے اور اس کا فیصلہ واعلان فاؤنڈیشن کورس ختم ہونے کے بعد کیا جائے اور اُس وقت یہ طے کرنے کے لیے کہ کس کو کون سی سروس دی جائے اور کسے کس صوبہ کے کیڈر میں تعینات کیا جائے، ان نئے افسروں کے صرف یو پی ایس سی امتحان کی میرٹ ہی کو بنیاد نہ بنایا جائے، بلکہ فاؤنڈیشن کورس کے دوران کس افسر کی کارکردگی کیسی رہی ہے، اس کو بھی زیرغور لایا جائے۔ وزارتوں ومحکموں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس ایشو پر اپنا ردعمل پیش کریں، لیکن یہ کہتے وقت الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ ”وزیراعظم کے دفتر نے خواہش ظاہر کی ہے کہ اس کا نفاذ اسی برس سے کیا جائے“۔

اس سلسلہ میں ہمیں یاد کرنا ہوگا کہ اب سے 165 برس قبل چارٹر ایکٹ 1853 کے ذریعہ ہی سرکاری عہدے دینے کے لیے حکومت ہند کی دستگیری (Patronage System) کا رواج منسوخ کر دیا گیا تھا۔اسے اسپوئیلس سسٹم (Spoils System) بھی کہا جاتا ہے، اسپوئیلس کے معنی ہیں مال غنیمت، یہ ممالک کے درمیان جنگ کی اصطلاح ہے، کیمبرج لغت کے مطابق اس کے معنی ہیں وہ مال، منافع یا فائدہ جو جنگ جیتنے سے حاصل کیا جائے۔ کالنس ڈکشنری کے مطابق یہ وہ انعام ہے جو لڑائی میں لوٹ کے یا تاخت و تاراج کے ذریعہ حاصل ہو۔امریکہ کی مشہور مصنف کیتھی سایر نے واشنگٹن پوسٹ میں لکھا کہ صدر ابراہم لنکن اس سسٹم سے بیحد پریشان تھے، جہاں سرکاری عہدے کھلے عام بیچے اور خریدے جاتے تھے۔اس کی وجہ سے حکومت کی نااہلیت پر عوام میں غم وغصہ تھا۔امریکہ کو دسیوں برس لگے جس کے دوران متعدد بل پیش کیے گئے اور پھر 1883 میں سول سروس سسٹم قائم کیا گیا، جس کے ذریعہ سیاسی حکوت میں تبدیلی کے باوجود بھی دیرپا افسر شاہی کے ذریعہ ملک میں استحکام و پائیداری قائم کی گئی۔ اسی بنیاد پر ڈیڑھ صدی قبل ہمارے ملک عزیز میں بھی سول سروسز میں تعین میں سب کے لیے یکساں موقع والا مقابلہ جاتی امتحان کا سسٹم رائج کر دیا گیا تھا، جس کا موجودہ اعلیٰ مقصد ہے متحدہ ڈھانچے اور معیاری نظام کے ذریعہ ہندوستان کی سالمیت ویکجہتی قائم رکھنا۔لہٰذا عقل سے پرے ہے کہ اب اکیسویں صدی میں اس سلسلہ میں وزیراعظم کے دفتر کے ذریعہ یہ رجعت پسند زوال پذیر اقدام(Retrogressive step) کیوں کیا جارہا ہے۔

جمہوریت کی مضبوطی کے لیے خودمختار سول سروس ایک اہم جز ہے،لیکن اگر وزیراعظم کے دفتر کی تاکید کا نفاذ ہوگیا تو یو پی ایس سی کے ذریعہ اعلان شدہ میرٹ لسٹ کا وقار خطرہ میں پڑ جائے گا۔اب سروس جوائن کرنے کے بعد ہونے والے فاؤنڈیشن کورس میں نئے متعین افسر کی کارکردگی کی قدر پیمائی کے نام میں یو پی ایس سی کی میرٹ لسٹ کے ساتھ دست درازی کی جائے گی۔ ایسا کرنے سے ہمارے دستور کے آرٹیکل309, 311, 312A کی روح مجروح ہوتی ہے، جن کی رو سے حکومت کو پابند کیا گیا ہے کہ سول سروسز کے ضابطے پارلیمنٹ کے ذریعہ ہی طے کیے جائیں گے، سول سروسز کے افسروں کے رینک میں کمی صرف اس طور پر کی جاسکتی ہے کہ ان کے خلاف انکوائری بٹھائی جائے اور معلوم کیا جائے کہ کس بنیاد پر کس کے خلاف کارروائی ہونے والی ہے۔ وزیراعظم کے دفتر کے ذریعہ اس مجوزہ تبدیلی سے ہمارے دستور کے بنیادی ڈھانچہ پر بھی ضرب لگے گی جس کے لیے عدالت عظمیٰ کے 7 جج صاحبان نے 1973 میں ہی کیشوآنند بھارتی بنام حکومت کیرالا کے مقدمہ میں فیصلہ کر دیا تھا کہ دستور کے بنیادی ڈھانچے کو ہر ادارہ پر برتری حاصل ہے اور اسے پارلیمنٹ بھی مخنث(Emasculate) نہیں بنا سکتی ہے (فیصلہ میں یہی لفظ استعمال ہوا)اور دستور کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کو توہین عدالت مانا جائے گا۔ بعد کے متعدد عدالتی فیصلوں میں بھی اسی اصول کو دہرایا گیا اور اس کو ناقابل تردید قرار دیا گیا۔ اسی اصول کی بنیاد پر 1975 میں سپریم کورٹ نے اندرا گاندھی بنام راج نرائن اور منروا ملس بنام حکومت ہند مقدموں میں پارلیمنٹ میں زبردست اکثریت سے پاس کی گئی دستور ہند میں 39ویں اور 42ویں ترمیموں کے کالعدم ہونے کا اعلان (Strike down) کر دیا تھا جن کے ذریعہ صدر جمہوریہ، نائب صدر، وزیراعظم اور لوک سبھا اسپیکر کے الیکشن کی تحقیق اور اس پر فیصلہ دینے کے عدالتی اختیار ختم کر دیے گئے تھے اور پارلیمنٹ کے ذریعہ بنائے گئے قوانین پر نظر ثانی کے اختیار سے بھی عدالتوں کو دستبردار کر دیا گیا تھا۔ اس بنیادی ڈھانچے کے عناصر میں ملک کا فلاحی ریاست (Welfare State) بنا رہنا، اس کی وفاقیت(Federalism)، جمہوریت، ملک کی سالمیت ویکجہتی، پارلیمانی سسٹم وغیرہ شامل ہیں، جن میں سے ہر ایک کے لیے آزاد سول سروس ناگزیر ہے۔

مجوزہ تبدیلی سے سول سروسز کے افسروں کا حوصلہ بھی پست ہو جائے گا اور وہ بے دھڑک منصفانہ مزاج سے فیصلے نہیں کرسکیں گے۔افسروں کے لیے سروس اور کیڈر کے الوکیشن میں سیاسی حکمرانی کو اختیار دینے سے سیاستدانوں کی ذاتی پسند ورائے کا دخل ہونے لگے گا، جس کی وجہ سے بدعنوانی کو فروغ ملے گا، وہ اس کا غلط استعمال کریں گے اور سول سروس جیسا پاکیزہ ادارہ مذاق بن کے رہ جائے گا۔ یاد رہے کہ کسی بھی سیاسی پارٹی یا گٹھ بندھن کے حکومت میں آنے سے قبل اور جانے کے بعد بھی سول سروس ہمیشہ طویل عرصہ کے لیے قائم ودائم رہتی ہے۔ اس مجوزہ کارروائی سے شیڈولڈ کاسٹ و شیڈولڈ ٹرائب کے لیے ریزرویشن بھی تحلیل ہونے لگے گا۔ مختلف سروسز کے درمیان اختلافات بڑھنے لگیں گے، جنرلسٹ بنام اسپیشلسٹ کے مابین جھڑپیں تیز ہو جائیں گی اور جزوی طور پر عدالتی اختیارات والے عہدوں(Quasi-judicial authorities) کے لیے بے غرضی وسکون قلب پر مبنی جو آواز اشد ضروری ہے اس پر بھی حرف آئے گا۔

خیر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ 2012 میں اس وقت کی یو پی اے حکومت کے دوران وزیر داخلہ پی چدمبرم نے ایک فائل چلا دی تھی کہ حکومت کے پاس 1400 آئی پی ایس افسروں کی کمی ہے اور ان کے تعین کے لیے یکساں موقع والا عوامی امتحان نہیں ہوگا، بلکہ جو لوگ مصلح افواج میں کیپٹن وغیرہ ہیں، صرف وہی اس امتحان میں شامل ہوسکتے ہیں۔ سچر کمیٹی کے ذریعہ غیر اشاعت شدہ اعداد وشمار سے ہمیں معلوم ہے کہ مصلح افواج میں مسلمان ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ لہٰذا ان 1400 آئی پی ایس افسروں میں تو مسلمان ندارد ہی ہوتے، اس پر ملت نے بہت شور مچایا تھا اور دہلی ہائی کورٹ میں احتجاجی عرضداشت بھی داخل کی تھی، پھر خدا کی مدد آئی اور ملک بھر کے آئی پی ایس افسروں کی تنظیم بھی ہمارے پس پشت کھڑی ہوگئی، ان کی تنظیم کے عہدہ دار مجھ سے ملے اور ان کی صوبائی اکائیوں نے ہماری عدالتی عرضداشت پر توثیقی پٹیشن داخل کر دی تھیں۔ تب وزیر سلمان خورشید نے بتایا تھا کہ وزیراعظم منموہن سنگھ نے اس تجویز کو مسترد کر دیا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو اب اسی طرح کا دستوری عمل دوبارہ کرنا پڑے گا۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 31 May-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

ریزرویشن کیلئے انتخابی حلقوں کا تعین غیر قانونی

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

دستور ہند نے تمام شہریوں کو یکساں حقوق دیے ہیں جن میں مساوات، آزادی، ووٹ دینے کا اختیار اور استحصال کے خلاف حق و دیگر حقوق شامل ہیں، لیکن ان تشفی بخش اصولوں کے باوجود ملک میں دانستہ حکمت عملی کے تحت کچھ طبقے سماجی اخراج اور عدم مساوات کے شکار بنائے گئے ہیں۔ عموماً مذہب، نسل، رنگ، ذات، جنس، عمر، صحت، جائے رہائش وغیرہ بنیاد بنتے ہیں عوامی اداروں میں تعصب کا۔ اس سوچے سمجھے اخراج کی وجہ سے متاثرہ گروپ حکمرانی کے اختیارات و مراعات، مواقع و ذرائع سے باہر ہی رہتا ہے۔ اس طرح سماج میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، ثقافتی و تعلیمی تفریق جنم لیتی اور جڑ پکڑتی رہتی ہے جس کی وجہ سے سماج میں برتری و ابتری کا احساس اور بندہ و آقا کا غیر اخلاقی امتیاز پنپنے لگتا ہے۔ قومی ثقافتی اقدار میں تخفیف ہونے لگتی ہے جس کا منفی اثر آگے آنے والی نسلوں پر پڑنے لگتا ہے۔ محکوم طبقہ کی خود اعتمادی، خود احترامی، خود مختاری، خودنگہداری اور خود وثوقی مجروح ہونے لگتی ہے، اس کی فرض شناسی کا جذبہ تحلیل ہونے لگتا ہے۔ ملکی طبقات کے مابین اسی فرق کی تحقیق و مطالعہ کیا وزیر اعظم ہند کے ذریعہ تفویض شدہ جسٹس سچر کمیٹی نے اور اس نے بڑے اعداد و شمار کی بنیاد پر منکشف کر دیا کہ ملک میں مسلمان سماجی، تعلیمی و اقتصادی طور پر مع شیڈولڈ کاسٹ باقی سب سے پیچھے ہیں۔ اس کی وجہ بتائی گئی مسلمانوں کا حکمرانی سے باہر رہنا، خصوصاً پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں نمائندگی سے۔ عوامی نمائندگی قانون اور حدبندی قانون کے تحت وہ انتخابی حلقے شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو کئے جانے چاہئیں جہاں شیڈولڈ کاسٹ کا فیصد سب سے زیادہ ہو۔ لیکن اس کے برعکس دراصل وہ انتخابی حلقے اور وارڈ ریزرو کئے جاتے ہیں جہاں شیڈولڈ کاسٹ کا فیصد کم ہے لیکن مسلمانوں کا فیصد کافی زیادہ ہے۔

اتر پردیش کے 80 لوک سبھا انتخابی حلقوں میں سے 17 شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہیں، وہاں کی اسمبلی میں 403 انتخابی حلقوں میں سے 84 شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہیں۔ مردم شماری 2011 کے مطابق لوک سبھا کی 17 ان سیٹوں میں سے 4 انتخابی حلقوں میں شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلے مسلمانوں کا فیصد زیادہ ہے، نگینہ میں مسلمان 53.54 ہیں اور بہرائچ میں 33 فیصد۔ اس کے علاوہ شاہجہان پور (21 فیصد) اور بلند شہر (20 فیصد) میں بھی مسلمانوں کا تناسب شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس کے برعکس اناؤ (30.6)، دھورہرا (30.5)، رائے بریلی (29.8)، مرزاپور (26.7) میں شیڈولڈ کاسٹ فیصد زیادہ ہے جبکہ وہاں مسلمان کم فیصد میں ہیں۔ اسی طرح یو پی کے 84 اسمبلی انتخابی حلقوں میں سے جو شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہیں، 14 میں مسلمانوں کا تناسب شیڈولڈ کاسٹ سے زیادہ ہے یہ ہیں نگینہ، نہٹور، پورقاضی، رامپور منیہاران، بلہا، ملاک، بلرامپور، ہرتیناپور، دھنوڑا، کپل واستو، ہاپوڑ، بسولی، فریدپور اور پورن پور۔ یہاں مسلمانوں کا تناسب 21 سے 64 فیصد ہے اور ان کے مقابلے میں شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب کافی کم ہے۔ اس کے برخلاف ہردوئی، مہولی، پروا، گروٹھا، مانک پور، بھگونت نگر، اونچاہار، ڈیباپور، سرینی، مدھو گڑھ، چرکھاری، اکبرپور رنیا، بدھونا، مہوبہ، بیینا، چترکوٹ، مہرانی، باہ، خیرگڑھ و10 دیگر اسمبلی انتخابی حلقے ایسے ہیں جہاں شیڈولڈ کاسٹ کا فیصد 20 سے 34 فیصد ہے جبکہ وہاں مسلم تناسب صرف 3 سے 8 فیصد ہی ہے۔ دستوری تقاضہ اور قانونی فریضہ ہے کہ یو پی میں پارلیمنٹ کے ان 4 اور اسمبلی کے ان 14 انتخابی حلقوں کو ریزرویشن کی قید سے آزاد کر کے دیگر انتخابی حلقے شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو کئے جائیں جہاں ان کا فیصد زیادہ ہے۔ اس طرح مسلمانوں کا دستوری حق انھیں واپس مل جائے گا۔ جسٹس سچر نے صرف اپنی رپورٹ کے متعلقہ باب میں ہی اس کا تفصیلی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ رپورٹ کے شروع میں پیش لفظ میں بھی دو پیراگراف میں اس پر زور ڈالا ہے اور وزیر اعظم کے نام اپنے منفرد خط میں تیسری دفعہ اس ایشو پر تاکید کی۔ یو پی سے ہی الگ ہو کر اتراکھنڈ بنا تھا، وہاں بھگوان پور، ہبریرا، جوالا پور اور باجپور اسمبلی حلقے شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہیں جبکہ وہاں مسلمان 25 سے 41 فیصد ہیں اور وہاں شیڈولڈ کاسٹ مقابلتاً کافی کم ہیں۔ ان کے برخلاف بھیم تال، یمنوتری، کپکوٹے، جگیشور، رام نگر، دیدی ہاٹ، دوارا ہاٹ، الموڑا وغیرہ ریزرو نہیں ہیں جبکہ وہاں شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب 22 سے 27 فیصد ہے اور وہاں زیادہ تر حلقوں میں مسلم تناسب ایک فیصد سے کم ہے ورنہ 4 فیصد سے زیادہ کہیں نہیں ہے۔

”عموماً مذہب، نسل، رنگ، ذات، جنس، عمر، صحت، جائے رہائش وغیرہ بنیاد بنتے ہیں عوامی اداروں میں تعصب کا۔ اس سوچے سمجھے اخراج کی وجہ سے متاثرہ گروپ حکمرانی کے اختیارات و مراعات، مواقع و ذرائع سے باہر ہی رہتا ہے۔ اس طرح سماج میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، ثقافتی و تعلیمی تفریق جنم لیتی اور جڑ پکڑتی رہتی ہے۔“

صوبہ بہار میں گوپال گنج پارلیمانی حلقہ شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہے جبکہ وہاں مسلمان 17 فیصد سے زیادہ ہیں اور شیڈولڈ کاسٹ صرف 12 فیصد ہی ہیں۔ اس کے برخلاف جہان آباد، نالندہ، کراکت اور اجیاپور میں شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب 20 فیصد یا اس سے زیادہ ہے اور وہاں مسلمان 7 سے 9 فیصد ہی ہیں لیکن یہ انتخابی حلقے ریزرو نہیں ہیں۔ بہار میں اسمبلی کے 9 حلقے ایسے ہیں جہاں مسلم تناسب شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے یہ ہیں منیہاری (41)، کوڑھا (33)، رانی گنج (27)، رام نگر (21)، ہرسدھی (19)، اور دھریہیا (19) جبکہ وہاں شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب بہت کم ہے۔ دوسری طرف اتری وزیر گنج، ٹکاری، استھاون، نبی نگر، ہموت، نالندہ وغیرہ اسمبلی حلقوں میں شیڈولڈ کاسٹ تناسب 22 سے 32 فیصد ہے اور وہاں مسلم تناسب ایک فیصد سے کم سے شروع ہو کر صرف 7 فیصد تک ہی گیا ہے، لیکن یہ اسمبلی انتخابی حلقے ریزرو نہیں ہیں۔

مغربی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی 27.1 فیصد ہے اور شیڈولڈ کاسٹ 23.5 فیصد ہیں۔ وہاں اسمبلی کے 11 انتخابی حلقے ایسے ہیں جو شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو ہیں جبکہ ان میں سے ہر حلقے میں مسلمانوں کا فیصد شیڈولڈ کاسٹ کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یہ حلقے ہیں میناکھن جہاں مسلمان 52 فیصد ہیں، ناباگرام (مسلمان 51 فیصد)، کھرگرام (مسلمان 50 فیصد)، سوروپ نگر (مسلمان 48 فیصد)، مگراہٹ پوربا (مسلمان 47 فیصد)، بسنتی (مسلمان 43 فیصد)، جے نگر (مسلمان 43 فیصد)، بروان (مسلمان 43 فیصد)، ہمت آباد (مسلمان 40 فیصد)، سنکریل (مسلمان 33 فیصد) اور کیش پور (مسلمان 27 فیصد)۔ ان حلقوں میں شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب مسلمانوں کے مقابلے بیحد کم ہے۔ دوسری طرف طوفان گنج (شیڈولڈ کاسٹ 53 فیصد)، علی پور دوار (شیڈولڈ کاسٹ 41 فیصد)، سونار پور اتر (شیڈولڈ کاسٹ 37 فیصد)، کاک دویپ، (شیڈولڈ کاسٹ 35 فیصد)، سونار پور دکھن (شیڈولڈ کاسٹ 34 فیصد)، چھتنا (شیڈولڈ کاسٹ 33 فیصد)، اونڈا (شیڈولڈ کاسٹ 32 فیصد)، شانتی پور (شیڈولڈ کاسٹ 32 فیصد)، چکدہا (شیڈولڈ کاسٹ 30 فیصد)، رانا گھاٹ اتر پچھم (شیڈولڈ کاسٹ 30 فیصد)، جموریا (شیڈولڈ کاسٹ 29 فیصد)، پندا بیشور (شیڈولڈ کاسٹ 29 فیصد)، بنکورا (شیڈولڈ کاسٹ 29 فیصد)، کرشنا اگر اتر (شیڈولڈ کاسٹ 28 فیصد)، ڈبگرام پھلبری (شیڈولڈ کاسٹ 28 فیصد) اور متعدد دیگر حلقوں میں شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب مسلمانوں سے زیادہ ہے لیکن وہ ریزرو نہیں ہیں۔ کچھ ایسے بھی حلقے ہیں جہاں شیڈولڈ کاسٹ اور مسلمانوں کا تناسب تقریباً برابر ہے، اگر مندرجہ بالا حلقوں کی صورت حال میں بدلاؤ لانے میں کامیابی ملتی ہے تو ان دیگر حلقوں پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 07 Jun-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

کشمیر: تجزیہ حالات اور سرکاری و عوامی ذمہ داری

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

کشمیر کے حالات میڈیا کے مطابق بہت خراب ہیں لیکن میں یہاں دس دن سے ہوں مجھے تو حالات بالکل نارمل دکھائی دے رہے ہیں۔ ویسے ملک کا کوئی بھی صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں ہر دن کچھ واردات ایسی نہ ہوتی ہو جو میڈیا میں نمایاں طور پر رپورٹ کی جانی چاہیے، لیکن میڈیا کی اپنی ترجیحات ہیں حالانکہ حال میں ہی 'آپریشن 136' نامی اسٹنگ کے ذریعہ کوبرا پوسٹ نے بے نقاب کردیا ہے کہ کن بنیادوں پر اور کس طرح یہ ترجیحات طے ہوتی ہیں اور اسی میڈیا کے ایک حصہ نے کوبرا پوسٹ کے اسٹنگ آپریشن کو بلیک آؤٹ کردیا، پھر بھی کوبرا پوسٹ نے اسے یوٹیوب پر پوسٹ کردیا ہے۔ اس سلسلہ میں 2009 میں الیکشن کمیشن نے ملک کو خبردار کیا تھا جس کے نتیجہ میں پریس کونسل آف انڈیا نے اپنی اہم رپورٹ پیش کی کہ کچھ میڈیا گھرانوں نے کس طرح مخصوص پیکیج اور ریٹ کارڈ بنائے ہیں، جن میں گنجائش رکھی گئی ہے کہ مقررشدہ رقم کی ادائیگی کرنے والے امیدواروں کے حق میں خبر چھپے گی۔ پھر بھی اس رپورٹ سے ملک میں کوئی لرزش پیدا نہیں ہوئی، وہ رپورٹ پریس کونسل آف انڈیا کی ویب سائٹ پر رہی اور پھر کال کوٹھری میں چلی گئی، ٹھیک اسی طرح جیسے ادائیگی شدہ نیوز پر پارلیمانی اسٹینڈنگ کمیٹی کی 2013 کی رپورٹ منظرعام سے غائب ہوگئی تھی۔ ادائیگی شدہ نیوز کی یہ روش پرفریب طور پر صحافت کے رول کو نئے سرے سے متعارف کرکے جمہوریت کو مجروح کررہی ہے۔ ایسے وقت میں جب عدلیہ و افسرشاہی سمیت دیگر جمہوری ستون بھی جمہوری اقدار کی پہلوتہی سے پورے طور پر مستثنیٰ نہیں ہیں۔ رغبتِ قطبیت کے اس زمانہ میں اب صرف نیوز ہی نہیں بک رہی ہے، بلکہ نقطہ نظر بک رہے ہیں۔ اس اسٹنگ آپریشن میں کوبرا پوسٹ کے ایک رپورٹر پشپ شرما نے فرضی کردار آچاریہ چھترپال اٹل کا بھیس بنا کر اگلے پارلیمانی الیکشن سے قبل مذہبی بنیاد پر ووٹروں کو تقسیم کرنے کی غرض سے پروپیگنڈا والی نیوز کے لیے 27 نیوز شاہراہوں پر رقم دینے کی پیشکش کی اور ان میڈیا ایگزیکٹیوز نے وہ پیشکش قبول کرلی۔ بعد میں ونود دوا نے 'جن گن من کی بات' کے اپنے سلسلہ وار ویڈیوز کے 249 ویں حصہ میں اس ایشو پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اصلی اعداد وشمار پیش کردیے ہیں۔ ادھر سابق سینئر سرکاری افسروں کے ایک وہاٹس ایپ گروپ پر دو روز قبل ہندی زبان میں خبر پوسٹ کی گئی جس میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ کچھ عرصہ قبل میانمار میں روہنگیا مسلمانوں نے ہندوؤں کا قتل عام کیا تھا۔ ایک افسر نے کہا کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کا حوالہ دیا جائے تو پوسٹ کرنے والے صاحب کو اچھا نہیں لگا کہ یہ حوالہ کیوں مانگا جارہا ہے۔ لہٰذا فسق و فجور کے موجودہ ملکی منظرنامے میں غلط بیانی کرکے پوری وادیٔ کشمیر کو دہشت گردی کی زد میں بتانے کی پشت میں اصل ایجنڈا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن صوبہ کے 99 فیصد سے زیادہ عوام باقی پورے ملک کے 99 فیصد عوام کی طرح امن پسند ہیں۔ انھیں موجودہ صورت حال کو ایک چیلنج مان کر زمینی سطح پر انفرادی جسم وروح اور اللہ کے دیے ہوئے ذاتی ذرائع کا مثبت استعمال کرکے دستور کی پابندی کے ساتھ ملت کو اندر سے مضبوط بنانے کے لیے مستقل تگ ودو کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

دوسری طرف حکومت کو اپنے قلیل مدتی سیاسی نقطہ نظر کے بجائے ہندوستان اور کشمیر کے طویل مدتی مفاد کو ترجیح دینی ہوگی، اگر مندرجہ ذیل 6 نکات پر مرکزی وصوبائی حکومتیں کام کرنا شروع کردیں تو جلد حالات میں بہتری آنا شروع ہو جائے گی۔

(a) کشمیر کے عوام پر مشتمل شہریوں کی 9 رکنی مانٹرنگ کمیٹی (Citizens Monitoring Committee-CMC) تشکیل دی جائے، جس میں وادیٔ کشمیر کی سول سوسائٹی کے 5 افراد ہوں، وادی کے باہر سے ملک بھر سے 2 افراد ہوں اور مرکزی وصوبائی حکومتوں کا ایک ایک نمائندہ ہو۔ وادیٔ کشمیر اور بیرون وادی پرائیویٹ اراکین میں سے ایک ایک کو کنوینر بنایا جائے۔ ہر ہفتہ میں کم از کم دو دفعہ اس کمیٹی اور مرکزی وصوبائی حکومتوں کے درمیان ای-میل پر خطوط ایکسچینج ہونے چاہئیں۔ (b) وادیٔ کشمیر کے عوام کے ذریعہ ان کی ضروریات کو رجسٹر کرنے کی غرض سے انٹرنیٹ کے ذریعہ آن لائن پورٹل قائم کیا جائے، جس کا نام رکھا جائے کشمیر ویلی سٹیزنس گریوانسز پورٹل (Kashmir Valley Citizens Grievances Portal)۔ (c) کشمیری عوام کے خلاف حفاظتی فورسز کے ذریعہ مبینہ زیادتیوں سے متعلق شکایتوں کی سنوائی کے لیے 2 رکنی انکوائری کمیشن قائم کیا جائے، جس میں سے ایک رکن وادیٔ کشمیر میں سے ضرور ہو۔ ہر شکایت سے متعلق دریافت شدہ نتائج تین ماہ کے اندر منظرعام پر آجائیں۔ (d) کسی بھی حالت میں زخمی ہوئے کشمیری عوام کو فوراً ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی یا دیگر جگہ پہنچا کر ان کا مکمل علاج محبت و شفقت کے ساتھ کروایا جائے۔ (e) وادی میں ہر 10,000 کی آبادی پر ایک انفارمیشن سینٹر، ریڈنگ روم و لائبریری قائم کی جائے، جس میں سرکاری مالی امدادا دی جائے اور مقامی لوگ اس کا انتظام کریں اور وہی لوگ طے کریں کہ وہاں کون سے اخبارات، کتابیں ورسالے مہیا کیے جائیں گے۔ مرکزی حکومت ملک کے 500 اعلیٰ ترین انڈسٹریل ہاؤسز سے اپیل کرے کہ ان میں سے ہر ایک کمپنی وادیٔ کشمیر کے کم از کم 10 نوجوانوں کو اپنے یہاں اچھا روزگار مہیا کرے اور جو کمپنیاں ایسا کریں، ان کی عوامی جلسہ میں تکریم کی جائے۔ (f) چند مرکزی وزارتیں اپنے یہاں کا ہر اشتہار اردو زبان میں وادیٔ کشمیر میں پڑھے جانے والے اخبارات میں شائع کرایا کریں۔ یہ وزارتیں ہیں: اسکل ڈیولپمنٹ وانٹرپرائزز (Skill Development & Enterprises)، یوتھ افیئرس (Youth Affairs)، ویمین و چائلڈ ڈیولپمنٹ (Women & Child Development)، مائیکرو اسمال ومیڈیم انٹرپرائزز (Micro, Small and Medium Enterprises)، ہیوی انڈسٹری و پبلک انٹرپرائزز (Heavy Industry & Public Enterprises)، سائنس وٹیکنالوجی (Science & Technology)، ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ (Human Resource Development)، کامرس و انڈسٹری (Commerce & Industry)، کلچر (Culture) اور مائنارٹی افیئرس (Minority Affairs)۔ وادی سے آئی ہوئی درخواستوں پر نرمی کے ساتھ خاص توجہ دی جائے۔

سردیوں کے موسم میں وادیٔ کشمیر میں بے گھر لوگوں کے لیے شب گزاری کے لیے بسیرے بنائے جائیں۔ عدالت عالیہ نے کہہ رکھا ہے کہ پناہ گاہ حاصل کرنا انسان کا بنیادی حق ہے، شدید سردی میں جان کا خطرہ سب سے زیادہ اہم معاملہ ہے۔ ہم سب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا سب سے زیادہ سرد علاقہ کشمیر کی وادی ہے۔ دنیا بھر کے موسمیات کی تفصیلات دینے والے عالمی پورٹل AccuWeather.Com کے مطابق دسمبر جنوری میں وادیٔ کشمیر کا درجہ حرارت 8 سے 3 ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔ یہاں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ شمالی ہند کے دیگر سرد علاقوں اتراکھنڈ اور ہماچل پردیش کی فی کس مجموعی گھریلو پیداوار (Per Capita GDP) جموں وکشمیر سے تقریباً دوگنی ہے۔ لہٰذا ہر برس شدید سردی شروع ہونے میں بہت کم مدت رہ جانے کے مدنظر حکومت بسیرے فراہم کرنے کو یقینی بنائے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ گرم بستر، گرم کپڑے (فرن وغیرہ) اور دوسری بنیادی ضرورت کی چیزیں کشمیر کے ضرورت مند لوگوں کو فراہم کی جائیں۔ وادیٔ کشمیر کو پوری دنیا کے لیے بہترین خوشنما خطہ بنایا جا سکتا ہے۔ ڈل جھیل کو دنیا کی سب سے خوبصورت جھیل بنایا جاسکتا ہے۔ ٹورزم کو بڑھاوا دینے کے لیے پوری دنیا میں ٹی وی وانٹرنیٹ پر اشتہار دیے جاسکتے ہیں۔ اس سے پورے ملک اور صوبہ کی اقتصادی حالت سدھرے گی۔ کشمیر کے نوجوانوں کی اقتصادی بازیابی اور ان کے خوبصورت مستقبل کی گارنٹی کے طور پر مخصوص پلان بنایا جاسکتا ہے۔ □❖□

"وادیٔ کشمیر کو پوری دنیا کے لیے بہترین خوشنما خطہ بنایا جاسکتا ہے۔ ڈل جھیل کو دنیا کی سب سے خوبصورت جھیل بنایا جاسکتا ہے۔ ٹورزم کو بڑھاوا دینے کے لیے پوری دنیا میں ٹی وی وانٹرنیٹ پر اشتہار دیے جاسکتے ہیں۔ اس سے پورے ملک اور صوبہ کی اقتصادی حالت سدھرے گی۔ کشمیر کے نوجوانوں کی اقتصادی بازیابی اور ان کے خوبصورت مستقبل کی گارنٹی کے طور پر مخصوص پلان بنایا جاسکتا ہے۔"

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 14 Jun-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

یو پی ایس سی کو نیچا دکھانے کی ایک اور سرکاری کوشش

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

مرکزی حکومت میں سرکاری عملہ کے تعین و ٹریننگ کے محکمہ (Department of Personnel & Training-DOPT) نے اشتہار دیا ہے کہ وہ دستوری ادارہ یو پی ایس سی کی پہلوتہی کرکے حکومت ہند کی دس وزارتوں میں جوائنٹ سکریٹری سطح کے افسروں کا تعین پرائیویٹ بزنس کمپنیوں میں سے کرنا چاہتا ہے۔ اس طریق کار کا نام رکھا گیا ہے 'پہلو کی طرف سے داخلہ' (Lateral entry)۔ یاد رہے کہ حکومت ہند میں جوائنٹ سکریٹری سطح کا افسر حکمرانی میں کلیدی رول ادا کرتا ہے، وہی حکومت کی پالیسی بناتا ہے اور وہی اس پالیسی کا نفاذ کرواتا ہے، اس کی پوسٹنگ کابینہ کی کمیٹی برائے تعیناتی (Cabinet Committee for Appointments-CCA) کرتی ہے۔ دیگر سرکاری سطحوں کی طرح جوائنٹ سکریٹری کے لیے بھی سول سروسز کے افسروں کا ہی تعین ہمیشہ کیا جاتا ہے، لیکن اب حکومت طرح طرح کے طریقے اپنا رہی ہے، جس کے ذریعہ اہم عہدوں پر وہ لوگ تعینات نہ ہوں جو قومی مقابلہ جاتی امتحان کے ذریعہ قابلیت کی بنیاد پر چنے گئے ہیں کیونکہ وہ لوگ تو سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا اپنا دستوری حق رکھتے ہیں لہٰذا وہ مکمل طور پر حکومت وقت کے تابعدار نہیں رہیں گے اور اس کے غیر دستوری فیصلوں کا نفاذ تو ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے بجائے اہم ترین عہدوں پر حکومت ایسے لوگوں کو لانا چاہتی ہے جن کا ان عہدوں پر فائز ہونے کا کوئی حق یا جواز نہ ہو اور اس طرح ان کے پاس غلط یا صحیح طور پر حکومت وقت کی تابعداری کرنے کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ اب جبکہ موجودہ حکومت کے پاس صرف چند مہینے ہی رہ گئے ہیں، کیا اس طرح کی بنیادی تبدیلیاں اسے زیب دیتی ہیں۔

> ”حکومت ہند کے تنظیمی ڈھانچہ میں جوائنٹ سکریٹری ماتحتی کرتا ہے ایڈیشنل سکریٹری و سکریٹری کی، یہ ماتحتی قومی جوہر میں تبھی تبدیل ہوسکتی ہے جب حکم عدولی کے طویل مدتی منفی نتائج ہوں۔ لیکن اگر کسی جوائنٹ سکریٹری کو معلوم ہو کہ وہ اپنے عہدے پر صرف 3 سے 5 برس تک ہی تعینات رہے گا تو حکومت کے تئیں اس کی فرمانبرداری کی رطوبت تحلیل ہوجائے گی، جس کی وجہ سے قومی مفادات خسارے میں رہیں گے۔“

حکومت کا یہ فیصلہ دستور کے آرٹیکل 39(b) اور (c) کی صریح خلاف ورزی کا مرتکب ہے۔ یہ دونوں آرٹیکل بڑی بزنس کمپنیوں کے وجود کی ہی تردید کرتے ہیں جن کی بنیاد ہے عوام کے مفاد کی اندیکھی کرتے ہوئے ملک کے مادّی وسائل و دولت کو چند ہاتھوں میں جمع رکھنا۔ دستور ساز اسمبلی میں اس آرٹیکل پر بحث کے دوران پروفیسر ٹی کے شاہ نے کہا تھا کہ یہاں اصل مقصد کی مزید وضاحت کی جانی چاہیے کہ ملک کے قدرتی وسائل جن میں زمین دوز کانیں، معدنی دولت، جنگلات، ندیاں اور ہر طرح کا بہتا ہوا پانی اور سمندری ساحل شامل ہیں، ان کی ملکیت، ان پر کنٹرول اور ان کے انتظام کا حق پورے ملک کا مجموعی طور پر ہوگا اور اس حق کا استعمال صرف حکومت ہی کرسکے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ تفصیل نہیں بیان کی گئی تو سماجی انصاف کا ہمارا عزم صرف خواب ہی بن کے رہ جائے گا، لہٰذا ہمیں پرائیویٹ مفاد کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑنی چاہیے۔ بعد میں 1987 کے بینیٹ کولمین کے مقدمہ میں عدالت عظمیٰ نے صاف کردیا کہ دستور کے ان آرٹیکلس کا نفاذ عدالت کے ذریعہ کروایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا پرائیویٹ بزنس کمپنی کے نمائندہ کے حکومت ہند میں جوائنٹ سکریٹری کے طور پر تعینات کیے جانے سے بڑے بزنس والوں کے مفاد اور حکومت کی دستوری ذمہ داریوں کے مابین تصادم پیدا ہوجائے گا۔ اشتہار کے مطابق ان نئے افسروں کی عمر 40 برس اور ان کی تعیناتی کی میعاد 3 سے 5 برس ہوگی۔ اس طور پر یہ لوگ 40 سے 45 برس کی عمر کے دوران حکومت کی پالیسیاں بنائیں گے اور اس کے بعد وہ اپنے بزنس گھرانوں میں واپس جاکر اگلے درجنوں برس تک اپنی خودساختہ پالیسیوں کا پھل نوش فرمائیں گے، چاہے اس سے عوامی مفاد کے کتنے ہی نقصانات کیوں نہ ہوں، جن شبہات کی بنیاد پر دستور میں مندرجہ بالا آرٹیکل شامل کیے گئے ہیں۔

حکومت ہند کے تنظیمی ڈھانچہ میں جوائنٹ سکریٹری ماتحتی کرتا ہے ایڈیشنل سکریٹری و سکریٹری کی، یہ ماتحتی قومی جوہر میں تبھی تبدیل ہوسکتی ہے جب حکم عدولی کے طویل مدتی منفی نتائج ہوں۔ لیکن اگر کسی جوائنٹ سکریٹری کو معلوم ہو کہ وہ اپنے عہدے پر صرف 3 سے 5 برس تک ہی تعینات رہے گا تو حکومت کے تئیں اس کی فرمانبرداری کی رطوبت تحلیل ہوجائے گی، جس کی وجہ سے قومی مفادات خسارے میں رہیں گے۔ خصوصاً مالیات، اقتصادی امور اور تجارت کی وزارتوں میں اس طرح سے پرائیویٹ کمپنیوں میں سے لوگوں کو لاکر اعلیٰ عہدوں پر بٹھادینے میں دستوری اقدار کی پامالی کا شدید ترین خدشہ ہے۔ ٹیکسوں کی شکل میں حکومت کی آمدنی و مال گزاری کے محکمہ (Revenue Department) میں جوائنٹ سکریٹری کا اہم رول ہوتا ہے یہ طے کرنے میں کہ کس پر کتنا ٹیکس لگے گا اور اسی کے مطابق سالانہ بجٹ ترتیب دیا جاتا ہے۔ دراصل وزیر خزانہ کے ذریعہ ہر سال پارلیمنٹ میں بجٹ پیش کرنے سے کئی ماہ قبل سے ہی نارتھ بلاک میں متعلقہ افسران کے دفتروں کے باہر دالان میں آنے جانے والوں پر کنٹرول کرنے کے لیے اضافی سیکورٹی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لیکن اب تو اندر جلوہ افروز جوائنٹ سکریٹری انہی بڑے بزنس گھرانوں کا وفادار ہوگا، جن کے خلاف یہ حفاظتی اقدامات کیے جاتے ہیں۔ اقتصادی امور و تجارت کے محکموں کا بھی یہی حال ہوگا۔ حکومت کی اس نئی کارروائی کا اثر یہ ہوگا کہ گویا سرکاری پالیسی بنانے کی ذمہ داری بڑے بزنس گھرانوں کو سونپی جارہی ہے۔

اشتہار میں یہ بھی لکھا ہے کہ پرائیویٹ بزنس کمپنیوں سے ایسے لوگوں کو لیا جائے گا جن کی سطح حکومت کے جوائنٹ سکریٹری کی سطح سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہ مطابقت طے کرنے کے لیے کن پیمانوں کو زیرغور لایا جائے گا، اس کا ذکر اشتہار میں نہیں ہے، اس کے لیے قومی سطح پر مدلل مباحثہ کی ضرورت ہے۔ آئی اے ایس و دیگر سول سروسز کے افسر لوگ سرکاری چال چلن سے متعلق ضابطہ (Conduct Rules) کے پابند ہوتے ہیں جس میں [4(1)] سختی سے منع کیا گیا ہے کہ کسی افسر کا کوئی رشتہ دار اس پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت نہیں کرے گا، جس کا کیس اس سرکاری افسر کے سامنے زیرغور ہو۔ یہ بھی منع کیا گیا ہے [4(3)(a)] کہ کوئی افسر کسی ایسی پرائیویٹ کمپنی کا معاملہ اپنے زیرغور نہیں لا سکے گا، جس سے اس افسر کے خاندان کا کوئی فرد بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی طرح کا کوئی بھی فائدہ اٹھا رہا ہو۔ لیکن اب حکومت کی اس نئی پالیسی کا نفاذ کرنے کے لیے سرکاری افسروں کے چال چلن پر پابندیوں کے اس ضابطہ کو بالائے طاق رکھنا ہوگا اور ساتھ ہی دستوری ڈھانچے کی بھی اندیکھی کرنی ہوگی۔ یہ بھی صاف نہیں ہوا ہے کہ اس طرح تقرر کرتے وقت حکومت شیڈولڈ کاسٹ و شیڈولڈ ٹرائب کے لیے ریزرویشن کس طرح کرے گی، اس ایشو پر حکمراں پارٹی کے ایم پی بھی پریشان ہیں۔ اس تعیناتی میں یو پی ایس سی کا کوئی رول ہوگا کہ نہیں اس پر بھی حکومت کے پاس فی الحال جواب نہیں ہے۔ کیا کل کو عدلیہ میں بھی اسی طرح حکومت اپنی پسند کے لوگ لانا شروع کردے گی۔ کیا پیچھے دروازے سے حکومت دستور کے بنیادی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ ادھر خبر آئی ہے کہ حکومت گجرات بھی اس نئے ماڈل کا نفاذ اپنے صوبہ میں کرنے جارہی ہے تو کیا اس سے ملک کا نظام درہم برہم نہیں ہونے لگے گا۔ اب یوگی جی کہنے لگیں گے کہ میں آئی اے ایس افسروں کی جگہ یوگیوں کو ہی تعینات کروں گا، پھر اگر کوئی سنگیت پریمی وزیراعلیٰ بن گیا تو وہ گویوں کو ہی اضلاع میں کلکٹر بنائے گا، آخر ہم اپنے شاندار ملک کو اندھیر نگری بنانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ ضروری ہے کہ حکومت ہند اپنی اس نئی پالیسی کے نفاذ کو زیرالتوا کردے جب تک اس کے مختلف پہلوؤں پر ملک میں تفصیلی بحث ہوکر اس کے نتائج کو منظر عام پر نہ لایا جائے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 21 Jun-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

زوال پذیر کشمیری دستکاروں کی کفالت

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

کشمیر میں موجودہ قیام کے دوران میں نے معلوم کیا کہ یہاں کے عوام کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کیا زمینی اقدام کیے جاسکتے ہیں، متعلقہ علاقوں میں گیا اور لوگوں سے گفتگو کی، تین اشیاء کی دستکاری اہم ہے: کریویل، قالین اور پشمینہ شال۔ کریویل (Crewel) کہتے ہیں اندرون خانہ آرائش کے ساز وسامان کے لیے استعمال کیے جانے والے پردوں، پلنگ پوش، غلاف تکیہ وغیرہ کے موٹے کپڑے پر مہین ہوک (Hook) کے ذریعہ ہاتھ سے کی گئی ایک خاص رنگ برنگی کشیدہ کاری کو۔ اس کپڑے کی چوڑائی 54 انچ ہوتی ہے اور یہ کسی بھی لمبائی کا خریدا جاسکتا ہے، مختلف سائز کے پلنگ پوش بھی بازار میں ملتے ہیں، زیادہ کشیدہ کاری والے کپڑے کی زیادہ قیمت ہوتی ہے۔ یہ کپڑا کئی قسم کا ہوتا ہے: سوتی، مخملی، خاص ریشہ سے بنا ہوا کپڑا جسے عرف عام میں لنن (Linen) کہتے ہیں۔ ریشمی، نیم ریشمی یا مصنوعی ریشم سے بنا ہوا کپڑا جسے آرگینزا کہتے ہیں اور پٹ سن (Jute)۔ یہ کشیدہ کاری ایک پلائی یا دو پلائی کی ہوتی ہے اور اس پر بھی خوبصورتی و قیمت کا انحصار ہوتا ہے، عموماً یہ کشیدہ کاری لڑکیاں وعورتیں ہی کرتی ہیں لیکن اس کے لیے ان کا محنتانہ ناقابل یقین حد تک کم ہوتا ہے۔ ملک میں تمام صوبوں میں کم ازکم مزدوری کی شرحیں قانونی طور پر یا سرکاری حکم کے مطابق طے ہوتی ہیں، جموں وکشمیر میں بھی محکمہ لیبر و ملازمت کے نوٹیفکیشن بتاریخ 26/اکتوبر 2017 میں اعلیٰ ہنرمند مزدور کے لیے روزانہ کم از کم مزدوری کی شرح 400 روپے معین کی گئی ہے، جبکہ کریویل کا کام کرنے والی خواتین کو ملنے والی یہ رقم 50 روپے یومیہ فی کس ہی ہوتی ہے۔ ہم نے سری نگر کے مقامی این جی او احساس ٹرسٹ کے ساتھ اشتراک کر کے طے کیا ہے کہ شروع میں کریویل کام کرنے والی 30 ضرورت مند خواتین کو مشترکہ طور پر تمام کچا مال بغیر ان سے قیمت لیے ہوئے مہیا کردیا جائے گا اور ان کے ذریعہ بنائے گئے کریویل کپڑے کو بازار میں رائج قیمت پر فروخت کروا کے اس میں سے کچے مال کی قیمت اور اس دوران انھیں دی گئی محنتانہ کی رقم روک کے باقی ساری رقم انھی خواتین کو دے دی جائے گی، اس طرح یہ خواتین خود کفیل ہو جائیں گی اور وہ اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے اپنا روزگار چلاسکیں گی، اس پائلٹ پروجیکٹ کی کامیابی پر اس کو بڑے پیمانے پر چلایا جائے گا۔

> ”پنجاب میں مشینوں سے شال تیار ہوتے ہیں اور بہت قلیل قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، لہٰذا ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ زبردست خسارہ میں ہیں۔ گاہکوں کو معلوم نہیں ہے کہ دستکاری سے بنا ہوا شال مقابلتاً بہت زیادہ گرمی دیتا ہے اور 100-50 برس تک اس کی تاثیر برقرار رہتی ہے۔، جبکہ مشین پر خالص پشمینہ چڑھ ہی نہیں سکتا ہے، اس کے ساتھ مصنوعی ایکریلک دھاگے کی ڈوریاں اور لچھے ملانے ہی پڑتے ہیں۔“

وادیٔ کشمیر میں قالین کی دستکاری کے پیشے میں لگے ہوئے افراد بھی اسی طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہیں۔ گاؤں میں عموماً 300 مربع فٹ کے جھونپڑی نما مکان میں شوہر بیوی اور بچے رہتے ہیں، سوتے ہیں، کھانا پکاتے ہیں اور اسی کے ایک کونے میں ہاتھ کا کرگھا لگا کر اس پر قالین بناتے ہیں۔ کچا مال مہاجن کے ذریعہ مہیا کیا جاتا ہے۔ ایک قالین کم ازکم چھ ماہ میں تیار ہوتا ہے۔ اس دوران انھیں مہاجن کی طرف سے اوسطاً 50 روپے یومیہ فی کس ملتا ہے اور دیگر ذاتی ضروریات کے لیے وہ مہاجن سے وقتاً فوقتاً قرض لیتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اصلیت میں مہاجن کے بندھوا مزدور بن کر ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ قرض کی ادائیگی نہ کرسکنے کی وجہ سے وہ کچھ اور کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ چھ ماہ یا اس سے زائد تک کام کر کے وہ قالین مکمل کردیتے ہیں اور اس دوران اس خاندان کو مہاجن کی طرف سے 40-35 ہزار روپے کی رقم مل چکی ہوتی ہے اور اب وہ قالین بازار میں اس کی 3-2.5 گنا قیمت میں بکتا ہے اور وہ منافع مہاجن اور دکاندار میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ معلومات کے مطابق ان خاندانوں میں کچھ افراد ایسے ہیں جو مہاجنوں کی رقم سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ شروعات میں انھی میں سے دس افراد کو ہم مکمل کچا مال مہیا کررہے ہیں اور انھیں قالین بنانے کے دوران روزمرہ کے ذاتی خرچ کے لیے رقم بھی دیں گے پھر جب وہ قالین بن کر تیار ہوجائے گا تو اسے بازاری قیمت پر فروخت بھی کروائیں گے اور اس رقم میں سے کچے مال کی قیمت اور انھیں دی گئی یومیہ رقم روک کر باقی کل رقم قالین بنانے والے افراد کو دے دی جائے گی، اس طرح اس کے بعد وہ لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں گے اور ان کی اقتصادی سطح میں اضافہ ہونے لگے گا۔ یہ پائلٹ پروجیکٹ کامیاب ہونے پر مستفیدین کا دائرہ بڑھادیا جائے گا۔ تخمینہ یہ ہے کہ جس خاندان کو فی الوقت ایک مربع فٹ قالین تیار کرنے کے عوض میں 400-700 روپے (ریشم، سوت، اون کے علیحدہ ریٹ ہیں) ملتے ہیں، انھیں اس پروجیکٹ کی وجہ سے ایک مربع فٹ قالین بنانے کے عوض میں 3000-4000 روپے مل سکیں گے۔

پشمینہ شال کے دستکاروں کا حال اور بھی زیادہ خراب ہے۔ پنجاب میں مشینوں سے شال تیار ہوتے ہیں اور بہت قلیل قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، لہٰذا ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ زبردست خسارہ میں ہیں۔ گاہکوں کو معلوم نہیں ہے کہ دستکاری سے بنا ہوا شال مقابلتاً بہت زیادہ گرمی دیتا ہے اور 100-50 برس تک اس کی تاثیر برقرار رہتی ہے، جبکہ مشین پر خالص پشمینہ چڑھ ہی نہیں سکتا ہے، اس کے ساتھ مصنوعی ایکریلک دھاگے کی ڈوریاں اور لچھے ملانے ہی پڑتے ہیں اس کے بغیر مشین پر پشمینہ پھسل جاتا ہے، شال بنے گا ہی نہیں۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ پشمینہ اون لداخ میں ہی ملتا ہے۔ وادیٔ کشمیر کے لوگ اسے وہیں سے خرید کے لاتے ہیں۔ ایک شال میں جتنا اون لگتا ہے وہ لداخ میں 1800-2000 روپے سے کم کا نہیں ملتا ہے۔ اس اون کی کتائی کر کے اسے دھاگے میں تبدیل کرتی ہیں۔ وادیٔ کشمیر کی تقریباً دو لاکھ خواتین ہیں، جو ایک دن میں عموماً تین گرام سے زیادہ اون کی کتائی نہیں کرپاتی ہیں، کیونکہ انھیں گھر گرہستی کے مزید کام بھی کرنے ہوتے ہیں، اس کے عوض میں انھیں 50 روپے فی گرام کے حساب سے محنتانہ ملتا ہے۔ جب یہ کتائی ہوجاتی ہے تو اس دھاگے کو شال کی شکل دینے کا کام ہوتا ہے مردوں کا، انھیں اس سے معمولی سی زائد مزدوری ملتی ہے۔ اس طرح ایک شال کے تیار ہونے تک تقریباً 5000 روپے کی مزدوری کثیر تعداد میں عورتوں اور مردوں کو مل چکی ہوتی ہے۔ کوشش کر کے حال ہی میں صوبائی حکومت کی طرف سے دستکاری کی پشمینہ شال پر مستند ہونے کی نمبر شدہ جی آئی (G.I.Mark) کی مہر لگائی جانے لگی ہے جس کی فیس 150 روپے فی شال ہوتی ہے۔

اس طرح کچے مال کی قیمت، اس کی بنوائی کی مزدوری، اس کی دھلائی اور جی آئی مارک کی فیس جوڑنے پر دستکاری کی ایک شال پر 7500 روپے کی رقم کی سرمایہ کاری ہو چکی ہوتی ہے۔ درمیانی درجہ کے شال کے کشمیری کاروباری افراد یہ کام کروا کے اس شال کو بازار میں دکانداروں کو 9500 فی شال کی شرح سے فروخت کردیتے ہیں، جہاں سے یہ شال کم از کم 16000 روپے میں گاہک کو بیچی جاتی ہے۔ اُدھر بازار میں ہاتھ سے بنی ہوئی کشمیری شال کے نام پر پنجاب میں مشینوں پر بنی ہوئی ایک شال اوسطاً 300-400 روپے کی بک رہی ہے۔ ہم اس فکر میں ہیں کہ گاہکوں تک دستکاری کی مستند شال کے فائدوں کا علم کس طرح پہنچایا جائے اور دکاندار کو ملنے والی منافع کی خطیر رقم کس طرح دستکاروں تک پہنچائی جائے۔ اس کے لیے یہ طے کیا گیا ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعہ اصل دستکاری کی روداد گاہکوں کو بتائی جائے اور شروعات میں کتائی کرنے والی 100 خواتین اور بنائی کرنے والے 20 مردوں کو کچا مال ان سے بغیر قیمت لیے ہوئے مہیا کردیا جائے اور جب شال بن کے تیار ہوجائے تو اسے انٹرنیٹ کے ذریعہ بازار میں فروخت کر کے حاصل شدہ رقم میں سے کچے مال کی قیمت اور تقسیم شدہ مزدوری کی رقم روک کے منافع کی باقی رقم کا استفادہ دستکاروں تک پہنچایا جائے۔ کریویل اور قالین کے یہ پروجیکٹ فی الحال ضلع باندیپورہ، تحصیل سوناواری کے زالپورہ گاؤں میں اور پشمینہ کا پروجیکٹ سرینگر میں مقیم شال کے چنندہ انسان دوست فیاض کاروباریوں کے توسط سے شروع کیے جارہے ہیں۔ زالپورہ میں طبی امداد کے قحط کی بنا پر وہاں مرسی ہوم میڈیکل سینٹر بھی قائم کیا جارہا ہے۔ کشمیر کے 37 چنندہ طلبا کی لکھنؤ میں تکنیکی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے، ان کی کفالت کی فکر بھی زیر غور ہے۔

❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 28 Jun-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

علی گڑھ و جامعہ ملیہ: یوگی آدتیہ ناتھ کا تساہل عارفانہ

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

یوگی آدتیہ ناتھ نے کہا ہے کہ اگر بنارس ہندو یونیورسٹی شیڈولڈ کاسٹ کو ریزرویشن دے سکتی ہے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ یہ ریزرویشن کیوں نہیں دے سکتے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کے سوال کا جواب سوال میں ہی چھپا ہوا ہے۔ اس سے ان کا مقصد شیڈولڈ کاسٹ کو فائدہ پہنچانا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کے زخموں کو کریدنا ہے جیسی ان کی عادت رہی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ 1950 میں صدارتی آرڈر کے ذریعہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو ریزرویشن کے دائرے سے مذہب کی بنیاد پر بے دخل کردیا گیا تھا اور ایسا کیا جانا دستور ہند کی روح اور خصوصاً آرٹیکل 15، 16، 25 کے خلاف ہے۔ جسٹس مشرا کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ 1950 میں صدارتی آرڈر کا پیرا 3 ایک ایسا سیاہ قانون ہے جو انتظامیہ کے ذریعہ دستور ہند کے باہر لکھا گیا اور اس کے بعد پیچھے کے دروازے سے دھکا دے کر دستور میں زبردستی جوڑا گیا ہے۔ اس وجہ سے گزشتہ 7 دہائیوں میں پورے ملک میں مسلمانوں کی زبردست حق تلفی ہوئی ہے، جبکہ غیر مسلم پسماندگان کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی صحت اب خوب فربہ ہوچکی ہے لیکن نتیجتاً اور اس کے برعکس آج کے ہندوستانی سماج میں باقی سب کے مقابلے میں مسلمان بری طرح پسماندہ ہوگئے۔

یہ معلوم ہونا بھی بہت ضروری ہے کہ 1950 میں مسلمانوں کی بے دخلی کا یہ فیصلہ کیوں اور کن حالات میں لیا گیا۔ اس سلسلہ میں 2010 میں حق اطلاعات قانون کے تحت ایک عرضی زیڈ ایف آئی نے وزیراعظم کے دفتر کو بھیجی تھی۔ اس میں درج فہرست ذاتوں کے آئینی حکم نامے [Constitution (Scheduled Castes) Order, 1950] کی بابت دریافت کیا گیا کہ اول تا آخر، اس کا مسودہ تیار کرنے، اس کے ڈھانچے اور وضع قطع تشکیل دینے اور اس آرڈر کو جاری کرنے کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا گیا تھا۔ اس عمل میں جو لوگ شامل تھے، ان کے نام اور عہدے و منصب کی تفصیل مانگی گئی۔ اس ریاضت کے دوران تمام وقوع پذیری و اجماع کی تاریخیں پوچھی گئیں۔ اس کے لیے مختلف صوبوں، مرکز کے زیر کنٹرول علاقوں اور دیگر اشخاص یا اداروں کو اس بابت جو خطوط جاری کیے گئے اور ان خطوط کے جو جوابات آئے ان کی نقلیں مہیا کرنے کے لیے کہا گیا۔ مسودہ تیار کرنے، اس کو بنانے سنوارنے اور اس کو جاری کرنے کے لیے اگر کوئی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں تو یہ تشکیل کس نے کی، ان کمیٹیوں کے اراکین کون کون تھے، ان میں سے کس نے کیا رول ادا کیا، ان سب سے متعلق دستاویزوں کی نقلیں مانگی گئیں۔ جو میٹنگیں ہوئیں ان کی روداد (Minutes) کی نقلیں مانگی گئیں۔ جو تجاویز موصول ہوئیں ان کی نقلیں بھی دینے کو کہا گیا۔ اس کام کے لیے اول ترین مسودہ کس تاریخ کو تیار ہوا، اس کی نقل مانگی گئی۔ اس کے بعد جب بھی اور جس سطح پر بھی مسودہ میں جو بھی تبدیلیاں کی گئیں، ان کی تفصیل اور ان سب کی نقلیں مانگی گئیں اور دریافت کیا گیا کہ وزیراعظم کو اور پھر صدر جمہوریہ کو مسودہ کس تاریخ کو پیش کیا گیا اور انھوں نے فائل پر کیا حاشیہ لکھا اور کب لکھا۔

>
>
> ’’جسٹس مشرا کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ 1950 میں صدارتی آرڈر کا پیرا 3 ایک ایسا سیاہ قانون ہے جو انتظامیہ کے ذریعہ دستور ہند کے باہر لکھا گیا اور اس کے بعد پیچھے کے دروازے سے دھکا دے کر دستور میں زبردستی جوڑا گیا ہے۔ اس وجہ سے گزشتہ 7 دہائیوں میں پورے ملک میں مسلمانوں کی زبردست حق تلفی ہوئی ہے۔‘‘

وزیراعظم کے دفتر نے یہ عرضی ضروری کارروائی کے لیے وزارت قانون میں محکمہ قانون سازی کو اور وزارت سماجی انصاف و اختیارات کو ارسال کردی اور یہ بھی لکھا کہ جو اطلاع وزیراعظم دفتر سے متعلق ہے، وہ باضابطہ طور پر مہیا کردی جائے گی۔ دریں اثنا وزیراعظم کے دفتر نے اطلاع دی کہ اس کے ریکارڈ کی بنیاد پر پایا گیا ہے کہ وزیراعظم کے دفتر میں ’’ایسی کوئی اطلاع موجود نہیں ہے‘‘۔ پھر وزیراعظم دفتر سے یہ بھی پوچھا گیا کہ کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ متعلقہ فائل اور ریکارڈ پی ایم او میں محفوظ نہیں رکھے گئے اور وہ کھو گئے یا یہ سمجھا جائے کہ پی ایم او کی متعلقہ فائل اور ریکارڈ کسی دوسری وزارت یا محکمہ یا کسی اور ہستی کو منتقل کردیے گئے، اگر ایسا ہے تو اس منتقلی کی مکمل جانکاری دی جائے۔ ان سوالات کا وزیراعظم دفتر سے جواب نہیں آیا۔ ادھر محکمہ قانون سازیہ نے یہ معاملہ وزارت داخلہ کو منتقل کردیا، جس نے کہا کہ یہ کام بعد میں وزارت سماجی انصاف و اختیارات کو سونپ دیا گیا تھا۔ وزارت سماجی انصاف و اختیارات نے اپنے خط میں لکھا کہ 1985 سے پہلے تک یہ معاملہ وزارت داخلہ کے تحت آتا تھا۔ ستمبر 2008 میں اپنے تین آفس میمورنڈموں کے ذریعہ وزارت داخلہ نے اپنے سابقہ ایس سی ڈویژن کی کچھ فائلیں وزارت سماجی انصاف و اختیارات کو سونپیں۔ ’’لیکن اس میں ایسی کوئی فائل نہیں ہے جس میں مطلوبہ اطلاع موجود ہونے کے آثار ہوں‘‘۔ لہٰذا وزارت سماجی انصاف و اختیارات سے ان تین میمورنڈموں اور فائلوں کی فہرستوں کی نقلیں مانگی گئیں، جن کے ذریعہ وزارت داخلہ سے فائلیں موصول ہوئیں۔ جواب میں وزارت انصاف و سماجی اختیارات اس بات پر بضد رہی کہ میمورنڈموں اور فائلوں کی فہرست کی نقلیں وزارت داخلہ سے ہی لی جائیں۔

ادھر وزارت داخلہ نے حق اطلاعات قانون کے تحت بھیجے گئے خطوط کی اندیکھی کرتے ہوئے اطلاع نہ فراہم کرنے کے لیے بہانہ بازی کی حد کردی۔ یہاں تک کہ اپنے مکتوب میں یہی لکھ دیا کہ حق اطلاعات قانون کے تحت اطلاع ٹرسٹ کو نہیں دی جاسکتی۔ حالانکہ مرکزی حکومت کے تمام محکمے مع وزیراعظم دفتر کے ٹرسٹ کو اطلاع فراہم کرتے رہے ہیں۔ خود وزارت داخلہ ٹرسٹ کو دیگر معاملات میں اطلاع فراہم کرتا رہا ہے اور جس کو اطلاع فراہم کی جاتی ہے، اس کے لیے قانون میں ’پرسن‘ (Person) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ عام شقوں سے متعلق قانون (General Clauses Act) میں ’پرسن‘ کی تعریف میں ’افراد کا غول‘ (Body of Individuals) شامل ہے جس میں ٹرسٹ بھی آتا ہے۔ لیکن وزارت داخلہ جانتی ہے کہ لمبی عدالتی کارروائی کے بعد اگر ان کے خلاف فیصلہ ہوتا بھی ہے تو بھی اُس وقت تک بات پرانی ہوچکی ہوگی۔ لیکن معاملے کو ایسے چھوڑنا نہیں ہے، ہمیں تیغ و کفن باندھے رہنا ہے۔

وزیراعظم کے دفتر نے بھی یہ نہیں بتایا ہے کہ وزیراعظم کو مسودہ کب پیش کیا گیا تھا اور انھوں نے فائل پر کیا حاشیہ لکھا تھا۔ ہاں محکمہ قانون سازی نے صرف اتنی اطلاع فراہم کی ہے کہ یہ معاملہ 8 / اگست 1950 کو مرکزی کابینہ میں پیش ہوا اور اسی روز کابینہ نے منظوری دے دی۔ 10 / اگست 1950 کو صدر جمہوریہ نے اپنی رضامندی دے دی اور 11 / اگست 1950 کو گزٹ میں اس حکم نامہ کی اشاعت ہوگئی۔ اس اطلاع کا منبع وہ رجسٹر بتایا گیا جس میں آئینی احکامات کا اندراج ہوتا ہے اور متعلقہ صفحہ کی نقل بھی دی گئی ہے۔ یہ ایسا ہے کہ خاندان کے فرد کو دشمن اغوا کرکے قتل کردیں اور بعد میں صرف پوسٹ مارٹم رپورٹ دی جائے، تفصیل بتائی ہی نہ جائے کہ قتل کیوں کر و کس طرح ہوا اور کس نے کیا۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے، ہمیں لائنوں کے بیچ پڑھنے کے آرٹ کا استعمال کرنا ہوگا۔ یہ بھی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حق اطلاعات کی طرح کے سخت قانون کے باوجود بھی ملک میں درحقیقت افسر شاہی کے اندرونی ایجنڈے کو ہی برتری حاصل ہے۔ دوسرا اہم نکتہ نکل کے یہ آتا ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کو ملک کی افسر شاہی میں مسلم فقدان کا نقصان بھگتنے کا آبشاری سلسلہ 1950 میں ہی شروع ہوگیا تھا اور ہنوز جاری ہے۔ ہم نے اپنی نقاہت کی تشخیص میں 7 دہائیاں لگادیں۔ یوگی کو چاہیے کہ 1950 کے صدارتی آرڈر کے پیرا 3 میں سے مذہب کی دستور مخالف شرط نکلوادیں، پھر شیڈولڈ کاسٹ کے لیے علی گڑھ و جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریزرویشن میں مضائقہ نہ ہوگا۔

❒❖❒

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

کے رحمان خاں کا جہانِ مکافات-I

جائزہ .... **ڈاکٹر سید ظفر محمود**

مرکز میں موجودہ یو پی اے حکومت کے ڈیڑھ برس سے کم رہ گئے ہیں۔اب جناب کے رحمان خاں صاحب نے وزیر اقلیتی امور کا عہدہ سنبھالا ہے۔ میں نے ان سے ملاقات کر کے انھیں دستاویز برائے یادداشت (Aid Memoire) پیش کر دیا ہے جس سے آسانی سے اور صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یو پی اے کے دس سال میں سے اب بچے ہوئے چودہ ماہ میں بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ان اشیوز پر میری ان سے گفتگو بھی ہوگئی۔ ملک کی پالسی بنانا سیاسی انتظامیہ کا کام ہوتا ہے اور اس پالسی کو بروئے کار لانا افسر شاہی کا۔خرابی تب پیدا ہوتی ہے جب وزراء کرام ذاتی نفس پرستی کی بنا پر پالسی بنانے کے اپنے کام کو بھی افسر شاہی پر چھوڑ دیتے ہیں۔لیکن رحمان خاں صاحب تو خود چارٹرڈ اکائنٹنٹ ہیں اور مسلمانوں کے ہمدرد ہیں۔ اللہ سے دعا ہے اور وزیر موصوف سے امید ہے کہ وہ اپنا ایک دن بھی ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ان کو وزارت کی کمان صحیح معنوں میں اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔

31 جولائی 2011 کو رحمان صاحب نے ٹو سرکلس ڈاٹ نٹ (TwoCircles.net) کے ذریعہ بیان دیا تھا کہ مسلم اوقاف کے بہتر انتظام کے لئے ایک علیحدہ کاڈر (انڈین وقف سروس) بنایا جانا چاہئے جیسا کہ سچر کمیٹی نے زوردار سفارش کی ہے۔ یہ بیان انھوں نے اس لئے بھی دیا کیونکہ وہ اس سے قبل دو برس تک جے پی سی برائے اوقاف کے چیرمین کی حیثیت سے پارلیامنٹ کو پیش کردہ اپنی رپورٹ میں لکھ چکے تھے کہ تمام صوبائی وزراء اعلیٰ نے جے پی سی کو بتایا کہ وقف بورڈ کے سی ای او کے عہدہ پر تعیناتی کے لئے مسلمان افسر عموماً نہیں مل پاتے ہیں کیونکہ مسلمان افسر بہت تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے ڈاکٹر' پرائمری ٹیچر' رٹائرڈ نائب تحصیل دار وغیرہ وقف کے سی ای او بنائے جاتے ہیں۔رحمان صاحب کے اس بیان سے مسلمانان ہند کے دکھے ہوئے دلوں کو آسودگی ملی تھی۔دریں اثناء قومی متعدد مسلم تنظیموں کے سربراہوں نے اور اقلیتی کمیشن نے وزارت اقلیتی امور کو لکھ کے وقف سروس کی وکالت کی ہے۔ان مکتوبوں کی نقلیں وزیر اعظم کو بھی دی گئی ہیں۔اس بابت اگلے چودہ ماہ رحمان صاحب کے لئے اعمال صالح کی کسوٹی ہیں۔

جے پی سی برائے اوقاف کے چیئر مین کی حیثیت سے ان کی سفارشات لائق تحسین ہیں۔ پھر بھی ان میں سے زیادہ تر کی وزارت اقلیتی امور نے نظر انداز کر دی اور انھیں وقف بل 2010 میں جگہ نہیں دی۔ان میں شامل ہیں: (i) صوبائی وقف بورڈ کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر کو مجسٹریٹ کے اختیارات دینا' (ii) ہر صوبہ میں وقف سروے کمشنر کے تعین کو لازمی قرار دینا اور 1947 سے اب تک کے ساری وقف املاک کو سروے میں شامل کرنا' (iii) سروے کمشنر کے نوٹیفکیشن کو میوٹیشن کی نظیر (Deemed Mutation) تسلیم کیا جانا' (iv) وقف املاک کو لیز پر دیتے وقت آرڈر میں لکھنا کہ رواں بازاری ریٹ پر ہی کرایہ لیا جائے گا' (v) ''ناجائز طور پر قابض شخص'' (Encroacher) کی جامع تعریف قانون میں لکھنا' (vi) وقف املاک کو ''احاطہ عامہ'' (Public Premises) کے طور پر تسلیم کرنا تاکہ ان پر سے ناجائز قبضہ ہٹانے میں آسانی ہو جائے' (vii) اوقاف پر سے ناجائز قبضہ ہٹانے کے لئے سی ای او کو بے دخلی (Eviction) کے اختیارات دینا' (viii) اوقاف پر ناجائز طور پر قابض لوگوں کو دو برس کی سزا اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ لگانے کا قانون بنانا اور اس جرمانہ کی رقم کو وقف فنڈ میں جمع کیا جانا' (ix) ناجائز قبضہ کو فوری طور پر قابل گرفت جرم (Cognizable Offence) مانا جانا' (x) جو سرکاری افسر ناجائز قبضہ نہ ہٹانے کے لئے ذمہ دار ہوں ان کو سزا کا دیا جانا'

> **رحمان خاں صاحب تو خود چارٹرڈ اکائنٹنٹ ہیں اور مسلمانوں کے ہمدرد ہیں۔ اللہ سے دعا ہے اور وزیر موصوف سے امید ہے کہ وہ اپنا ایک دن بھی ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ ان کو وزارت کی کمان صحیح معنوں میں اپنے ہاتھ میں لینی ہو گی۔**

(xi) ''وقف املاک کے احاطہ'' (WaqfPremises) کی جامع تعریف قانون میں شامل کرنا' (xii) وقف ٹریبیونل کے فیصلہ کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک سال کی میعاد مقرر کرنا' اور (xiii) اوقاف کی نشوونما کے ذریعہ آمدنی کا استعمال کر کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے قومی بورڈ کی تشکیل دینا۔ یہ مجرب قانونی اقدامات کا ایک مرکب ہے جس کے ذریعہ ملک میں وقف املاک کی خستہ حالی پر قابو پایا جا سکتا ہے اور ان کے استعمال کا دھارا مسلمانوں کی ارتقاء کی طرف موثر انداز میں موڑا جا سکتا ہے۔

مرکزی وقف کاؤنسل کے سکریٹری کے عہدہ پر تعیناتی کے لئے متعلقہ ضوابط میں صرف یہ لکھا ہے کہ وزیر موصوف جس مسلمان کو چاہیں سکریٹری بنا سکتے ہیں۔ ملک میں کسی بھی دیگر ذمہ دار ادارہ کے بارے میں بنائے گئے قانون یا سرکاری ضوابط میں اس قدر لاتعلقی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اہل ہنود کے صدقاتی املاک کی دیکھ بھال کے لئے تقریباً ایک درجن صوبائی قوانین میں درج ہے کہ گو کہ ان کا ہندو ہونا لازمی ہے لیکن ان مذہبی املاک کے سرپرستوں کا حکومت کا سینئر ترین افسر ہونا بھی ضروری ہے۔لہٰذا ہر دیوستھان' بڑے مندر' وغیرہ کے ٹرسٹ کا سکریٹری سینئر آئی اے ایس افسر ہی ہوتا ہے۔اس کے برخلاف اوقاف کی مرکزی کاؤنسل کے سکریٹری کے لئے کسی بھی سرکاری سطح کا ہونا لازمی ہے ہی نہیں۔نتیجتاً' مرکزی وقف کاؤنسل کے سکریٹری کو حکومت کی تمام وزارتوں اور محکموں کے افسر خاطر میں نہیں لاتے ہیں جس کی وجہ سے نظام اوقاف زبردست خسارہ میں ہے۔اس کی ایک حالیہ مثال ہے مرکزی وقف کاؤنسل اور محکمہ آثار قدیمہ کے افسران کی تماہی میٹنگ کی رپورٹیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میٹنگوں میں آثار قدیمہ کا ہی پلڑا بھاری رہتا ہے اور اوقاف کو ان میٹنگوں کا استفادہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ اسلئے سچر کمیٹی نے سفارش کی کہ مرکزی وقف کاؤنسل کے سکریٹری کا حکومت ہند کے کم سے کم جوائنٹ سکریٹری سطح کا افسر ہونا لازمی قرار دیا جائے۔تاکہ وہ تمام وزارتوں و محکموں وغیرہ پر اعلیٰ سطح پر اثر انداز ہو سکے۔لیکن وقف بل 2010 میں اس اہم سفارش کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی وجہ بتائی گئی کہ مسلم اوقاف کے ساتھ یہ سوتیلا برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے۔ رحمان خاں صاحب کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اقلیتوں کے لئے وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام کی مانیٹرنگ برائے نام ہو رہی ہے۔اس رسی کو مضبوط کرنا ہوگا۔اس میں ہر سطح پر مسلمانوں کو شامل کرنے سے ہی کچھ کام چلےگا۔اردو اساتذہ کے تعین کے کام کی صوبائی سطح پر دیکھ ریکھ (Follow up) مرکز کو کرنے کی ضرورت ہے۔ چودہ سو فاضل آئی پی ایس افسران کے تعین کے مسلم مخالف طریقہ کار پر گواہاٹی ہائی کورٹ نے روک لگا دی ہے۔ رحمان صاحب کو وزارت داخلہ و پی ایم او میں پیروی کرنی ہوگی کہ گواہاٹی ہائی کورٹ کے آرڈر کے خلاف حکومت اپیل نہ کرے۔اس سلسلہ میں رحمان صاحب کے پیش رو وزیر نے وزیر داخلہ و وزیر اعظم سے گفتگو کی تھی۔ اس بات کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مسلم رزرویشن کا آندھرا ہائی کورٹ و سپریم کورٹ میں اس طور پر دفاع کرنا ہوگا کہ 1950 سے ہی مسلمان درجہ فہرست ذاتوں کی تعریف سے بے دخل کر دئے گئے تھے اسلئے وہ تعلیمی' اقتصادی و سماجی طور پر باقی سب سے بہت زیادہ پچھڑ گئے ہیں۔لہٰذا ان کے لئے آئین کے آرٹکل 16 کے تحت رزرویشن دیا جانا ضروری ہے جیسا کہ جسٹس مشرا کمیشن نے سفارش کی ہے۔ رحمان صاحب کا ہمیں اس جہان مکافات میں استقبال کرنا چاہئے۔ آئے ہم ان سے علامہ اقبال کی زبانی کہیں: آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں۔

◆◆◆

کے رحمٰن خاں کا جہانِ مکافات-II

جائزہ .... **ڈاکٹر سید ظفر محمود**

سچر کمیٹی نے شکایت کی ہے کہ پارلیمنٹ و اسمبلیوں کے تمام انتخابی حلقے جہاں مسلمانوں کا تناسب کافی زیادہ ہے اور وہاں درج فہرست ذاتوں (Scheduled Castes) کے لوگ تھوڑے سے ہی ہیں وہ درج فہرست ذاتوں کے لیے ریزرو کر دیے گئے ہیں (Reserved Constituencies)۔ اس کے برعکس انھیں صوبوں میں دیگر متبادل انتخابی حلقے موجود ہیں جہاں درج فہرست ذاتوں کے لوگوں کا تناسب بہت زیادہ ہے اور وہاں مسلمان تھوڑے سے ہی ہیں، وہ حلقے درج فہرست ذاتوں کے لیے ریزرو نہیں ہیں۔ اس طرح مسلمانوں کو دوہرا نقصان ہوا ہے اور وہ چھ دہائیوں سے درحقیقت ان دونوں طرح کے حلقوں میں انتخابی روش سے باہر ہیں۔ سچر کمیٹی نے کہا کہ یہ رویہ یقیناً پر تعصب ہے۔ یہی صریح وعیاں وجہ ہے مرکزی وصوبائی قانون ساز ایوانوں میں مسلم نمائندگی کا تناسب مضحکہ خیز سطح تک کمتر ہونے کی۔ لہٰذا سچر کمیٹی نے کہا کہ مرکزی حکومت اس معاملہ میں فوراً دلچسپی لے اور ڈیلمیٹیشن کمیشن (Delimitation Commission)، جو انتخابی حلقوں کی حدود مقرر کرتا ہے، کو ہدایت دے کر اس دیرینہ بے ضابطگی کو رفع کروائے۔ لیکن حکومت نے اس ایشو پر اب تک کوئی بھی کارروائی نہیں کی ہے۔ رحمٰن صاحب سے پوری امید ہے کہ وہ اس سلسلہ میں متحرک ہو جائیں گے اور ملت کو وقتاً فوقتاً اپنی کاوشوں کے اس سفر میں پڑنے والے سنگ میلوں سے آگاہ کرتے رہیں گے۔

سچر کمیٹی کی اہم سفارشات برائے مساوی مواقع کمیشن (Equal Opportunities Commission) اور تنوع کے فروغ کے لیے ترغیبی اسکیموں (Incentive Schemes based on Diversity Index) کے باریک نکتوں کو شکل دینے کے لیے مرکزی حکومت نے پانچ برس قبل ماہرین کے دو الگ گروپ متعین کر دیے تھے، جنھوں نے طویل تحقیق و گفت وشنید کے بعد اپنی رپورٹیں وزارت اقلیتی امور کو اب سے تین سال قبل ہی پیش کر دی تھیں، لیکن حکومت نے اس کی بابت کیوں اب تک خاموشی اختیار کر رکھی ہے یہ عقل سے پرے ہے، علاوہ اس کے کہ مساوات وتنوع میں دلچسپی کم اور الیکشن سے قبل شام کے ماحول میں گرماہٹ لانے کی فکر زیادہ ہے۔ خدا کرے منفی رجحان یہیں تک محدود ہو اور اب تو جسٹس سچر کی ان دونوں اہم سفارشات کو سرکار عملی جامہ پہنا دے۔ رحمٰن صاحب ضرور اس طرف توجہ دیں گے۔

مدارس میں دینی نصاب کے ساتھ ساتھ سائنس، کمپیوٹر، سماجیات، حساب و انگریزی پڑھانے میں مالی امداد کی مرکزی اسکیم (SPQEM) کی تفصیل مدارس وعوام الناس تک پہنچانے کے لیے وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو ہر سال پچاس لاکھ روپے دیے جاتے ہیں۔ لیکن حق اطلاع قانون کے تحت وزارت نے بتایا کہ تین سال تک ڈیڑھ کروڑ روپے ملنے کے باوجود اسکیم کے اردو و دیگر زبانوں میں ترجمہ اور اس کی اشاعت پر اس نے کوئی بھی رقم خرچ نہیں کی۔ ہونا یہ چاہیے کہ بیس صفحات پر مشتمل اس اسکیم اور درخواست کے فارم کا اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں ترجمہ کروایا جائے اور اس کی ڈیڑھ دو لاکھ نقلیں کروا کے تمام مدارس کے ذمہ داروں کو بھیجی جائیں۔ اخبارات، ٹی وی اور ریڈیو پر اشتہارات آنے چاہئیں۔ مارچ 2012 میں دہلی کے ایک عوامی جلسہ میں اس وقت کے وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کے روبرو یہ حقائق پیش کیے گئے تو اگست میں وزارت نے ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی۔ لیکن اس کمیٹی کی ایک بھی میٹنگ کی روداد آج تک وزارت کی ویب سائٹ سے ندارد ہے۔ ساتھ ہی سچر کمیٹی نے یہ بھی کہا تھا کہ مدارس اور این آئی او ایس و یونیورسٹیوں کے مابین سرٹیفکیٹ و اسناد کی باہمی ہم قدری وان کے درمیان مترادفات (Equivalence) بنانے کے لیے میکانزم قائم کیا جائے تا کہ مدارس کے سند یافتہ جو طلبا ملک کے وسیع باضابطہ تعلیمی ڈھانچہ میں شامل ہونا چاہیں وہ ایسا خوش اسلوبی سے کر سکیں۔ یہ کام سی بی ایس ای (CBSE) اور یو جی سی (UGC) کے ذمہ کیا گیا تھا جہاں یہ معاملہ شروعاتی منزلوں کے بعد منجمد ہو گیا۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، سی بی ایس ای اور یو جی سی کی اس بیزاری کو دور کرنے اور ان کو متحرک بنانے کے لیے امید ہے کہ رحمٰن صاحب جلد ضروری پیش قدمی کریں گے۔

مدارس میں دینی نصاب کے ساتھ ساتھ سائنس، کمپیوٹر، سماجیات، حساب و انگریزی پڑھانے میں مالی امداد کی مرکزی اسکیم (SPQEM) کی تفصیل مدارس و عوام الناس تک پہنچانے کے لیے وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کو ہر سال پچاس لاکھ روپے دیے جاتے ہیں۔ لیکن حق اطلاع قانون کے تحت وزارت نے بتایا کہ تین سال تک ڈیڑھ کروڑ روپے ملنے کے باوجود اسکیم کے اردو و دیگر زبانوں میں ترجمہ اور اس کی اشاعت پر اس نے کوئی بھی رقم خرچ نہیں کی۔

جن وقف املاک پر مرکزی وصوبائی حکومتوں کے دفاتر اور سرکاری رہائش گاہیں ناجائز طور پر قائم ہیں، ان کے لیے اندرا گاندھی نے وزرائے اعلیٰ کے نام اپنے 1976 کے مکتوب میں کہا تھا کہ انھیں یا تو وقف بورڈوں سے رواں بازاری ریٹ پر حکومت کے نام باقاعدہ لیز کروا لیا جائے اور لیز کے کرایہ کا بقایا بھی ادا کر دیا جائے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو وقف املاک خالی کر کے اوقاف کے سپرد کر دی جائیں۔ اندرا گاندھی کا وہ خط سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں شائع کیا ہے اور اظہار افسوس کیا کہ وزارت عظمیٰ کی اس ہدایت پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ اب اوقاف سے متعلق راجیہ سبھا کی سلیکٹ کمیٹی نے 2011 میں سفارش کی ہے کہ اندرا گاندھی کی ہدایت کے متن پر عمل کرنے کے لیے وقت کی میعاد وقف قانون میں مقرر کر دی جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ رحمٰن صاحب سلیکٹ کمیٹی کی یہ سفارش وقف بل 2010 کے تصحیح شدہ مسودہ میں شامل کریں گے۔ متعلقہ وقف املاک کی صوبہ وار فہرستیں سچر کمیٹی کی رپورٹ کے آخر میں منتھی ہیں۔

ہم سب واقف ہیں کہ ملک کی افسر شاہی میں مسلمانوں کی حصہ داری ان کے قومی سطح کے تناسب کے مقابلہ میں ایک چوتھائی یا کہیں کہیں ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہے۔ رحمٰن صاحب کی وزارت ایک اسکیم چلاتی ہے جس کا نام ہے مقابلہ جاتی امتحانوں کے لیے فری کوچنگ اسکیم (Free Coaching & Allied Scheme)، لیکن اس اسکیم کی شرط ہے کہ استفادہ لینے والی تنظیم خود کوچنگ دے۔ سول سروسز میں کامیاب ہونے کے لیے ایک امیدوار کو 900 سے زائد امیدواروں پر برتری حاصل کرنی ہوتی ہے۔ لہٰذا سول سروسز کی کوچنگ دینے کے لیے اس میدان کے طویل تجربے کے ساتھ ساتھ سالہا سال امتحان میں پوچھے جانے والے سوالات کے بدلتے ہوئے پیچ وخم اور ان کے جوابات کے طرز مارکنگ پر مسلسل عقابی نظر رکھنی ہوتی ہے۔ یہ ہنر صرف پارینہ پیشہ ورانہ اداروں کے پاس ہی ہو سکتا ہے نہ کہ ہر این جی او یا ادارہ کے پاس۔ یہی وجہ ہے کہ سول سروسز کے تعلق سے اس وزارت کی یہ اسکیم اب تک ناکام رہی ہے۔ اسکیم میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ این جی اوز ضرور درخواست دیں لیکن انھیں اس کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اگر خود کوچنگ نہ دے کر اپنے ذریعہ منتخب امیدواروں کی کوچنگ ملک کے کامیاب ترین سول سروسز کے پرائیویٹ کوچنگ اداروں (اتفاقاً، ایسے سارے ادارے دہلی میں ہیں) میں کروانا چاہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں اور اس کے لیے بھی وہ وزارت کی دی ہوئی رقم کا استعمال کر سکتے ہیں۔ بیشک وزارت اخراجات پر پوری نظر رکھے اور آڈٹ کروائے۔ پھر دیکھیے ملک کی حکمرانی میں مسلم شمولیت کا کیسا نقشہ بدلتا ہے۔ لیکن وزارت کو اپنی مرضی سے اور ملت کے حق میں چلانے کے لیے منفی طاقتوں پر غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔ ملت کا یہ خوش آئند احساس ہے کہ رحمٰن صاحب صرف اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اور وہ ان کے اس عزم مبارک کو علامہ اقبال کی زبانی خوب سمجھ رہی ہے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری ، نفَس مرا شعلہ بار ہو گا

□□

کے رحمٰن خاں کا جہانِ مکافات-III

جائزہ .... **ڈاکٹر سید ظفر محمود**

سچر کمیٹی نے بڑی معقول سفارش کی کہ ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کے فقدان کے ازالہ کے لیے حکومت کو چاہیے کہ انتظامیہ کے اہم عہدوں پر اور پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں مسلمانوں کی اس طرح نامزدگی کریں کہ ان کا تناسب قومی سطح پر 13.4% اور صوبوں میں وہاں کی مناسبت سے ہوجائے۔ اس سفارش کے متعلق سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ یہ کام اُس طرز پر کیا جائے جیسا کہ حکومت آندھرا پردیش نے اپنے صوبے میں کر رکھا ہے۔ جب وزارت برائے اقلیتی امور میں سچر کمیٹی کی سفارشات پر افسر شاہی نے اپنے حاشئے لکھے تو اس سفارش کے سامنے لکھ دیا کہ ''اس سفارش کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے اسے وہاں بھیج دیا جائے'' اور اس کینہ آمیز عمل نے سچر کمیٹی کی اس کلی کو کھلنے سے پہلے ہی جھلس جانے پر مجبور کر دیا۔ حق اطلاعات قانون کے تحت حاصل شدہ وزارت برائے اقلیتی امور کے اس دستاویز کی نقل راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ پچھلے 6 برس میں مرکزی یا کسی صوبائی حکومت نے اس سفارش پر کوئی عمل نہیں کیا۔ وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خاں کو چاہیے کہ مرکزی حکومت کی تمام وزارتوں و محکموں کے تمام ذمہ دار وزیروں اور صوبائی وزرائے اعلیٰ کو فوراً خط لکھ کر ان سے کہیں کہ سچر کمیٹی کی اس سفارش پر عمل کیا جائے اور اس عمل درآمد کی سہ ماہی رپورٹ وزارت برائے اقلیتی امور کو بھیجی جائے۔ یہ خط وزارت کی ویب سائٹ پر جاری کر دیا جائے۔ اسی طرح مرکزی وزارتوں و محکموں اور صوبوں وغیرہ سے آنے والی رپورٹیں بھی ویب سائٹ پر مہیا کی جائیں۔

سچر کمیٹی رپورٹ کے صفحہ 246 پر سفارش کی گئی ہے کہ یو جی سی (UGC) کے ذریعہ تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ کا متبادل طریق کار (Alternate Admission Criteria) نافذ کیا جائے۔ اس طرح داخلہ کے لیے ذاتی قابلیت کا 60% اور پسماندگی کا 40% وزن مانا جائے۔ پسماندگی کے تعین میں شامل ہونے چاہئیں (i) سالانہ گھریلو آمدنی' (ii) متعلقہ ضلع یا شہری کچی آبادی کی خستہ حالی اور (iii) خاندانی ذریعہ روزگار کی نوعیت۔ چونکہ 6 سال میں اس سفارش پر بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی لہٰذا رحمٰن صاحب کو چاہیے کہ فوراً وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کو خط لکھیں کہ یو.جی سی کو اس معاملہ میں ضروری احکامات دیے جائیں۔ یو.جی سی میں بھی بڑی دلجوئی سے پیروی کرنی ہوگی۔ تاکہ تدریسی سیشن 14-2013 میں داخلہ کا نیا طریق کار نافذ ہو سکے۔ سچر کمیٹی نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کی اہمیت کے بارے میں افسر شاہی و حکومت کے دیگر اسٹاف کو حساس بنایا جائے (Sensitization)۔ اس کے لیے مخصوص لکچرز کیے جائیں جس میں پاور پوائنٹ پرزنٹیشن کے ذریعہ اس ایشو کی اہمیت سمجھائی جائے۔ ماڈل پاور پوائنٹ پرزنٹیشن بنا کے وزارت اقلیتی امور کی ویب سائٹ پر ڈال دیا جائے۔ پہلا لکچر وزارت برائے اقلیتی امور کے ہی افسران و اسٹاف کے لیے کیا جائے۔

پچھلے ہفتہ ہیومن چین نامی ایک تنظیم نے دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے آڈیٹوریم میں سچر کمیٹی کی سفارشات پر ایک کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ رحمٰن خاں صاحب مہمان خصوصی تھے۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے اعلان کیا کہ سچر کمیٹی اور جوائنٹ پارلیمانی کمیٹی برائے اوقاف کی رپورٹوں اور ہرش مندر کی 2011 کی رپورٹ 'وعدے جو پورے ہونا باقی ہیں' (Promises to

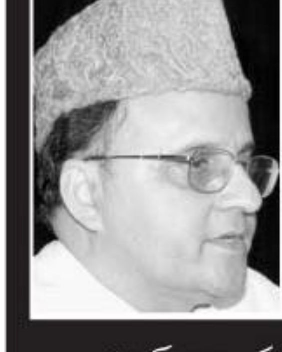

وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمٰن خاں کو چاہیے کہ مرکزی حکومت کی تمام وزارتوں و محکموں کے تمام ذمہ دار وزیروں اور صوبائی وزرائے اعلیٰ کو فوراً خط لکھ کر ان سے کہیں کہ سچر کمیٹی کی اس سفارش پر عمل کیا جائے اور اس عمل درآمد کی سہ ماہی رپورٹ وزارت برائے اقلیتی امور کو بھیجی جائے۔ یہ خط وزارت کی ویب سائٹ پر جاری کردیا جائے۔

Keep) پر ان کی وزارت از سر نو غور کرے گی اور ان کی سفارشات پر عمل کرے گی۔ رحمٰن صاحب نے یہ بھی صاف طور سے کہا کہ وہ قومی وقف اکیڈمی (National Waqf Academy) قائم کروائیں گے اور انڈین وقف سروس (Indian Waqf Service) کے قیام کی پہلی کڑی کے طور پر قومی وقف اکیڈمی کے تحت ٹریننگ شدہ ایک وقف کیڈر جلد تیار کروائیں گے۔

ہرش مندر نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ وہ سیاسی عزم و بصیرت جس کی وجہ سے سچر کمیٹی کی تقرری ہوئی ان اقدامات میں نہیں پائے جاتے جو ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو درپیش ہمہ پہلو نقصانات کی تلافی کے لیے مناسب اور کافی حد تک مطلوب ہیں۔ سچر کمیٹی رپورٹ کی روشنی میں اگرچہ مسلمانوں کی محرومی کا ازالہ کرنے کے لیے پالیسی وضع کی جانی تھی لیکن اس کے نفاذ کا وقت آتے آتے یہ پالیسی تمام اقلیتوں تک وسیع ہو گئی۔ انھوں نے لکھا کہ مسلمانوں پر پالیسی کو واضح طور پر فوکس کرنے میں حکومت کی جھجھک نمایاں ہے۔ یہ جھجھک پروگراموں کو زمینی سطح پر نافذ کرنے والی افسر شاہی کے ذریعہ مسلمانوں کی محرومی کے اسباب کو نشانہ بنا کر کام کرنے سے قصداً گریز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہرش مندر نے کہا کہ مرکزی وزارت برائے اقلیتی بہبود سے لے کر ضلعی اور ذیلی سطح کے افسران میں ضروری جذبۂ اختیار اور مسلمانوں کے ساتھ سماجی و اقتصادی تفریق سے لڑنے کے لیے واضح اقدامات کا فقدان ہے۔ مسلمانوں کے بہت زیادہ ارتکاز (Concentration) والے ضلعوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے حکمت عملی کے طور پر بڑی اہم سفارش کی کہ بنیادی ڈھانچے یا انفرااسٹرکچر والی اسکیموں (Infrastructure Schemes) کی منصوبہ بندی کے لیے (ضلعوں کے بجائے) گاؤں اور وارڈ کو اکائی بنایا جائے۔ ورنہ اسکیموں کا نفاذ زیادہ تر ضلع کے اس خطہ میں ہوتا ہے جہاں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ رحمٰن صاحب نے بتایا کہ اس ایشو پر پلاننگ کمیشن میں غالباً کچھ تحریک ہے۔ جنوری کا مہینہ بہت اہم ہے۔ قومی بجٹ پر کام چل رہا ہے۔ اس معاملہ پر وزارت کو ہر دن تگ و دو کرنی ہوگی۔

ہرش مندر نے یہ بھی سفارش کی کہ حکومت کو خصوصی طور پر مسلمانوں کے واسطے ترقیاتی پروگراموں میں سرمایہ کاری کے لیے بجٹ میں الگ سب پلان (Sub-Plan) تشکیل دینا چاہیے اُسی طرح جیسے حکومتیں درج فہرست ذاتوں کے لیے کرتی ہیں (جبکہ درج فہرست ذات کی تعریف میں سے مسلمانوں کو ایک سازش کے تحت 1950 میں ہی نکال دیا گیا تھا)۔ ہرش مندر نے زور دیا ہے کہ مرکزی حکومت کو مسلمانوں کے لیے 25,000 کروڑ روپے کا خصوصی جزوی پلان (Special Component Plan) بنانا چاہیے۔ 15,000 کروڑ روپے مسلمانوں کے لیے نئے تعلیمی ادارے کھولنے اور 10,000 کروڑ روپے چھوٹے تجارتی ادارے قائم کرنے اور دیگر معاشی مواقع مہیا کرنے کے لیے مختص کیے جائیں۔ ہمارے ملک میں تمام اقلیتوں کو جوڑ کے ان کی مجموعی آبادی ملک کی کل آبادی کا 19% ہے۔ پھر بھی پلان کی کل تقسیم (Total Plan Allocation) میں سے اقلیتوں کے لیے وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام کے لیے صرف 15% حصہ ہی دیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کو بڑھا کے کم سے کم 19% تو کر ہی دیا جائے۔ بلاک و ضلع سطح پر سرکاری اسکیموں کے بارے میں اطلاعات و رہنمائی کے لیے مسلم نوجوانوں کی مدد سے سہولتیں مراکز (Facilitation Centres) قائم کیے جائیں۔ افراد ملت کو اپنا فریضہ منصبی تو نبھانا ہی ہوگا' ساتھ ہی وہ رحمٰن صاحب سے بھی علامہ اقبال کی آواز میں کہہ رہے ہیں کہ:

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی بینا ہے' دانا ہے' توانا ہے

نئے حوادث ٹپک رہے ہیں.. قطرہ قطرہ

جائزہ .... **ڈاکٹر سید ظفر محمود**

مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور کے رحمان خاں نے بتایا ہے کہ وہ مساوی مواقع کمیشن بل (Equal Opportunity Commission Bill) پارلیمنٹ کے بجٹ سشن 2013 میں پیش کریں گے۔ اس کمیشن کی تشکیل کی سفارش سچر کمیٹی نے کی تھی۔ یہ اطلاع وزیر موصوف نے 28 جنوری 2013 کو اپنی وزارت میں مسلم رہنماؤں ودانشوروں کے ساتھ ایک میٹنگ میں دی۔ ساتھ ہی وزیر اقلیتی امور نے یہ بھی بتایا کہ مرکزی حکومت نے ہرش مندر کی اس اہم سفارش کو بھی تسلیم کرلیا ہے کہ اقلیتوں کی فلاح کی غرض سے پلاننگ اور اسکیموں کے نفاذ کے لئے اب اقلیتی اکثریت والے 776 بلاکوں (Blocks) کو اکائی مانا جائے گا نہ کہ ضلع کو۔ یاد رہے کہ مسلم رہنما اس اہم نکتہ پر متعدد بار حکوت کی توجہ دلا چکے ہیں اور تقریباً ایک ماہ قبل رحمان خاں نے ایک عوامی جلسہ میں یقین دہانی کرائی تھی کہ اس سمت کام ہورہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ 776 بلاک اقلیتی فرقوں کی نمایاں تعداد والے 196 ضلعوں پر موقوف ہیں جبکہ اب سے قبل اس طرح کے صرف 91 ہی ضلعوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ہرش مندر نے اپنی 2011 کی رپورٹ 'وعدے جو پورے ہونا باقی ہیں' (Promises to Keep) میں لکھا تھا کہ ضلع کو اکائی ماننے سے ضلع کے مسلم اکثریت کے حصے خسارے میں رہتے ہیں۔ اب مسلم اکثریت والے بلاکوں پر توجہ مرکوز ہونے سے یہ پریشانی کسی حد تک دور ہو جائے گی، حالانکہ ہرش مندر نے اس سے بھی بہتر سفارش یہ کی تھی کہ دیہی علاقوں میں گاؤں کو اور شہری علاقوں میں وارڈ کو اکائی مانا جائے۔ یہ معلوم ہونا باقی ہے کہ گاؤں اور وارڈ کو اکائی ماننے میں حکومت کو کیا قباحت ہے۔

وزیر اقلیتی امور نے یہ بھی بتایا کہ ان کی وزارت نے معلوم کرلیا ہے اور نمائندگانِ ملت کا یہ الزام صحیح پایا گیا ہے کہ اقلیتوں کو بینک سے جو قرض ملتا ہے اس کا سب سے کم حصہ مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے (حالانکہ مسلمان ملک کی کل اقلیتی آبادی کا 73% ہیں)۔ لہٰذا انھوں نے بینک کے چیرمینوں کی ایک میٹنگ اس مدعے پر طلب کی ہے۔ سچر کمیٹی کی ایک اور اہم سفارش تھی تنوع کی بنیاد پر ترغیب (Incentives based on diversity index) دینے کے لئے اسکیموں کا بنایا جانا۔ اس کے تحت جو بھی شخص یا دفتر یا کمپنی یا ادارہ کوشش کر کے یہ یقینی بنا دے کہ اس کے کام کا استفادہ حاصل کرنے والوں میں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے تناسب کے مطابق شامل رہیں تو ایسے خیر اندیش شخص، دفتر، کمپنی یا ادارہ کو انعام و اکرام سے نوازا جائے۔ رحمان صاحب نے بتایا کہ اس اسکیم کا مسودہ تیار ہے اور اس کا نفاذ غالباً قومی اقلیتی کمیشن کے سپرد جلد کردیا جائے گا۔

پارلیمنٹ، صوبائی اسمبلیوں، ضلع پریشدوں اور گرام پنچایتوں میں مسلمانوں کی اپنے تناسب کے مقابلے میں بیحد کم نمائندگی کی نہایت اہم وجہ ہے زیادہ مسلم آبادی والے انتخابی حلقوں کا شیڈولڈ کاسٹ کے لیے ریزرو کر دیا جانا (جبکہ شیڈولڈ کاسٹ کی تعریف میں سے مسلمانوں کو ملک کی انتظامیہ کے ذریعہ ایک سازش کے تحت 1950 میں ہی خارج کردیا گیا تھا)۔ لہٰذا سچر کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ انتخابی حلقوں کے ریزرو کیے جانے کے عمل کو از سر نو زیر غور لایا جائے اور جن حلقوں میں مسلمان زیادہ ہیں انھیں شیڈولڈ کاسٹ کے ریزروڈ چنگل سے چھڑایا جائے۔ اس کے لیے مرکزی حکومت کو ڈیلیمیٹیشن کمیشن کو تاکیدانہ خط لکھنا تھا۔ 2006 میں سچر کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے بعد عرصہ دراز تک ڈیلیمیٹیشن کمیشن موجود تھا لیکن مرکزی

> ”وزیر اقلیتی امور نے یہ بھی بتایا کہ ان کی وزارت نے معلوم کر لیا ہے اور نمائندگانِ ملت کا یہ الزام صحیح پایا گیا ہے کہ اقلیتوں کو بینک سے جو قرض ملتا ہے اس کا سب سے کم حصہ مسلمانوں کے ہاتھ لگتا ہے (حالانکہ مسلمان ملک کی کل اقلیتی آبادی کا 73% ہیں)۔ لہٰذا انہوں نے بینک کے چیرمینوں کی ایک میٹنگ اس مدعے پر طلب کی ہے۔“

حکومت نے اسے خط نہیں لکھا۔ 28 جنوری 2013 کو رحمان خاں صاحب کے دفتر میں اس موضوع پر ایک دفعہ پھر بحث ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اب دوبارہ جب ڈیلیمیٹیشن کمیشن کا تعین ہوگا تب ہی یہ معاملہ اس کے سامنے اٹھایا جا سکے گا۔ اس پر مسلم رہنماؤں نے شدید رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ رادھا کے ناچنے کے لیے نو من تیل کا انتظار کرنے کی اب قطعی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان 65 برس سے زبردستی خسارہ میں رکھے جا رہے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ محرومی و پامالی کے اس سلسلہ کو مزید طول دیا جائے۔ حکومت کو چاہئے کہ اگلے ڈیلیمیٹیشن کمیشن کی تشکیل جلد کردے اور اس کو یہ کام اولیت سے کرنے کی تاکید کرے۔

ہرش مندر نے یہ بھی تجویز رکھی تھی کہ قومی بجٹ میں شیڈولڈ کاسٹ کی طرح مسلمانوں کے لیے الگ سب پلان بنایا جائے۔ وزیر موصوف نے اس پر غور کرنے کے لئے کہا۔ سچر کمیٹی، مشرا کمیشن اور ہرش مندر تینوں نے زور دے کر کہا ہے کہ حکومت کی فلاحی اسکیموں کے نفاذ سے زمینی سطح پر مسلمانوں کو جوڑنا ضروری ہے۔ وزیر اقلیتی امور نے بتایا کہ ضلع سطح پر مانیٹرنگ کمیٹی میں اب تک صرف حکام ہی ہوتے ہیں لیکن اب حکومت یہ ہدایت جاری کررہی ہے کہ اس کمیٹی میں اقلیتوں کے لوگ بھی شامل کئے جائیں۔ اس کے علاوہ اقلیتی عوام میں سے ہی ہر ضلع میں ایک رابطہ کار (District Coordinator) تعینات کیا جائے۔

وزارت میں منعقد اس میٹنگ میں پاور پوائنٹ پیشکش کے ذریعہ آکسفیم (Oxfam) کے ڈائرکٹر اویناش کمار نے بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی مفلسی میں فی الحال صرف 1.7% ہی تخفیف ہوئی ہے جبکہ اسی وقفہ میں شیڈولڈ کاسٹ اور شڈیولڈ ٹرائب کی مفلسی میں 27% اور 17% کمی ہوئی ہے۔ میٹنگ میں قومی اقلیتی کمیشن کے علاوہ مسلمانوں کی رہنما تنظیموں [جن میں شامل تھے کنفیڈریشن آف والنٹری ایسوسی ایشنز (COVA، جس کی ایماء پر یہ میٹنگ منعقد ہوئی)، آل انڈیا جماعت اسلامی ہند، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا، موومنٹ فور امپاورمنٹ آف مسلم انڈینس، چائلڈ ویلفیئر کوئیلیشن اور مسلم صحافی و اراکین پارلیمنٹ] نے وزیر اقلیتی امور کو بارآور کرایا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ پر چھ سال تک ملک گیر فکرآمیز غور خوض ہو چکا۔ اب حکومت کو مسلمانوں کی فلاح کے لیے خصوصی اقدامات کرنے کے سلسلے میں کسی وسوسہ، حجاب یا جھجھک میں نہیں رہنا چاہئے اور نہ اس پر بغلیں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کا آئین کے دفع 16 کی روشنی میں غیر متعصب تجزیہ کیا جائے تو مسلمانوں کے لئے مخصوص اسکیمیں بنانے اور ان کے نفاذ کے لئے صریح فرمان حاصل ہے اور کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ بہرحال 2007 سے اب تک موجودہ مرکزی حکومت میں مسلمانوں کے تئیں جو جمود اور منفیت کا ماحول طاری تھا اس میں رحمان صاحب کے وزیر اقلیتی امور بن جانے کے بعد کچھ تو کشادگی و مثبت جنبش کا احساس ہونے لگا ہے۔ 28 جنوری کو وزارت میں ان کے کمرہ میں ہوی میٹنگ میں پہلی دفعہ لوگوں نے دیکھا کہ وزیر خود کمان سنبھالے ہوئے ہیں نہ کہ افسر شاہی کا نمائندہ بن کے ان کی روائتی ترجمانی کررہے ہوں۔ ملت کو یقین ہے کہ رحماں خاں اپنی موجودہ وزارت کا کام کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر گنگنا رہے ہوں گے:

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

□❖□

ملک کی حکمرانی میں مسلم حصہ داری کا فقدان

جائزہ .... **ڈاکٹر سید ظفر محمود**

آزادی کے بعد سے پہلی مرتبہ اتر پردیش اسمبلی میں اقتدار والی پارٹی کے مسلم نمائندگان کی تعداد مردم شماری میں بتائی گئی صوبہ کی مسلم آبادی کے تناسب سے کم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ایسا سماجی انصاف آزادی کے بعد سے آج تک نہ پارلیمنٹ میں ہوا ہے اور نہ ہی صوبائی اسمبلیوں میں۔ امید کی کرن جگی ہے کہ مرکزی اور صوبائی سطح کی سیاسی پارٹیاں مستقبل میں اس بات کا دھیان رکھیں گی کہ پارلیمنٹ، صوبائی اسمبلیوں اور قانون ساز اداروں، ضلع پنچایتوں، تعلقہ کمیٹیوں، گرام پنچایتوں اور میونسپل بورڈوں میں مسلم نمائندوں کی تعداد مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے کم نہ رہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو آزادی سے چلی آرہی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کم ہو سکتی ہے۔

ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی حصہ داری کا فقدان سچر کمیٹی کی رپورٹ کا اہم جز ہے۔ مردم شماری کے مطابق ملک میں مسلمان 13.4% ہیں۔ لہٰذا لوک سبھا میں 71 مسلمان ہونے چاہئیں۔ اس کے برخلاف آزادی کے بعد سے آج تک سارے انتخابات کی بنیاد پر معلوم ہوتا ہے کہ لوک سبھا میں مسلمانوں کی تعداد اوسطاً 27 رہی ہے (جبکہ ایک ایک مرتبہ یہ تعداد کم سے کم 18 اور زیادہ سے زیادہ 45 تک گئی ہے)۔ اسمبلیوں کا حال بھی زیادہ مختلف نہیں رہتا ہے۔ اس طرح مرکزی و صوبائی ایوان کی دس فیصد سے زیادہ سیٹوں پر جہاں مسلمانوں کے ذریعہ نمائندگی کئے جانے کا حق ہے، وہاں دیگر اہل وطن صاحبان اطمینان سے قیام پذیر رہتے ہیں۔ اس طرح ملک بھر میں مسلمانوں کی باضابطہ حق تلفی کی جاتی رہی ہے۔ آیئے اس غیر متناسب قلیل سیاسی نمائندگی کی وجوہ پر غور کریں۔

آئین میں درج فہرست ذاتوں (Scheduled Castes) کے لوگوں کیلئے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ریزرویشن ہے۔ درج فہرست ذاتوں کی تعریف متعین کرنے کے لئے صدر جمہوریہ نے 1950 کے اپنے آرڈر میں ہر صوبہ کی ان پیشوں کی فہرستیں بنائیں جن کو صدیوں سے سماجی طور پر کمتر سمجھا جاتا رہا ہے، لیکن ساتھ ہی صدر نے یہ شرط لگا دی کہ ان پیشوں کے صرف ان ہی لوگوں کو ریزرویشن کا فائدہ ملے گا جو ہندو ہوں حالانکہ ایسی شرط لگانا آئین کی شق 15 اور 16 کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ بعد میں 1956 میں سکھوں کو اور 1990 میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کو جوڑ دیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کو ریزروڈ سیٹوں سے ایک منظم سازش کے تحت تعصبانہ انداز میں محروم کر دیا گیا۔ بات یہاں رکی نہیں۔ جلے پر نمک کے طور پر کثیر تعداد میں وہ انتخابی حلقے جہاں مسلمانوں کا تناسب بہت زیادہ ہے، لیکن درج فہرست ذاتوں کا تناسب بہت کم ہے، انھیں ریزرو کر دیا گیا۔ دوسری طرف اسی صوبہ میں جن انتخابی حلقوں میں مسلمان بہت کم ہیں اور وہاں درج فہرست ذاتوں کا تناسب بہت زیادہ ہے، انھیں ریزرو نہیں کیا گیا اور یہ سوچا سمجھا تعصب آج تک جاری ہے۔

اس سانحی تسلسل کے علاوہ مستقل یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اول تو سیاسی جماعتیں مسلمانوں کو ٹکٹ دیتی نہیں ہیں اور جو مسلمان انتخاب میں حصہ لیتے بھی ہیں، ان میں سے بہت قلیل فیصد کامیاب ہو پاتے ہیں۔ یہی وجوہ ہیں کہ مسلمان مرکزی و صوبائی قانون ساز ایوانوں میں اپنی متناسب نمائندگی کے حق سے ہنوز محروم ہیں۔ اس کڑوی حقیقت کا اعتراف سچر کمیٹی کی رپورٹ میں صاف صاف کیا گیا ہے۔ اور حکومت سے کہا گیا ہے کہ ڈی لمیٹیشن کمیشن (Delimitation Commission: مرکزی حکوت کا وہ دفتر جو انتخابی حلقوں کی حدبندی کا ذمہ دار ہے اور وہی یہ بھی طے کرتا ہے کہ درج فہرست ذاتوں کیلئے کن کن انتخابی حلقوں کو ریزرو کیا جائے گا) کے ذریعہ اس زبردست بے ضابطگی کو دور کروایا جائے، لیکن حکومت کی طرف سے اس بابت کسی بھی سطح پر کوئی پیش رفت ہوئی ہو ایسا مسلمانوں یا ان کے بہی خواہوں کے علم میں نہیں ہے۔ دھیان رہے کہ افراد ملت کو بھی اس معاملہ میں دلچسپی لینی ہوگی۔

اس تعلق سے سچر کمیٹی نے ایک اور بڑا مجرب نسخہ تجویز کیا ہے، لیکن اس کی طرف ملت کے ارباب بصیرت کی نظر اب تک نہیں گئی۔ سچر کمیٹی نے کہا کہ منڈل و ضلع پریشدوں میں، میونسپل بورڈوں و کارپوریشنوں میں، کوآپریٹو بینکوں و زراعتی مارکیٹنگ کمیٹیوں میں مسلمانوں کو نامزد کیا جانا چاہئے۔ اس کیلئے سچر کمیٹی نے مرکزی و صوبائی حکومتوں کی توجہ دلائی کہ آندھرا پردیش اسمبلی نے اس طرح کی نامزدگی کے اختیارات دینے کیلئے متعلقہ صوبائی قوانین میں ضروری ترمیمات کی ہیں۔ سچر کمیٹی

یہ بھی جان لینا بہت ضروری ہے کہ پورے ملک میں مرکزی، صوبائی، ضلعی و مقامی سطح پر روز دسیوں ہزار فیصلے ہوتے ہیں اور ان میں سے 95% کارروائیوں میں اوپر سے نیچے تک کسی مسلمان کا کوئی رول نہیں ہوتا ہے۔ یہ تمام فیصلے مسلمانوں کی غیر موجودگی میں اور بغیر مسلمانوں کے مفاد کو ذہن میں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

نے کہا کہ آندھرا پردیش کی طرز پر مرکزی و سبھی صوبائی حکومتیں بھی کارروائی کریں۔ علاوہ ازیں جن سرکاری عہدوں اور کمیٹیوں کی رکنیت وغیرہ کیلئے نامزدگی کرنے کا اختیار صوبائی یا مرکزی حکومتوں کو ہے وہاں تو مسلمانوں کو ترجیح دی جا سکتی ہے، لیکن مرکزی وزارت برائے اقلیتی امور کی افسر شاہی نے جب سچر کمیٹی کی سفارشوں پر اپنے نوٹ تیار کئے تو اس اہم سفارش کے متعلق سینئر افسروں اور وزیر کو گمراہ کرنے کیلئے لکھ دیا کہ "یہ معاملہ آندھرا پردیش حکومت سے متعلق ہے اور اسے بھیج دیا جائے گا"۔ اس بابت اوپر کسی سطح پر کوئی پوچھ تاچھ نہیں ہوئی اور اس معقول سفارش کی تدفین عمل میں آگئی۔ لہٰذا 2006 میں جب سچر کمیٹی کی رپورٹ پیش ہوئی تب سے آج تک اس اہم سفارش پر کسی صوبائی یا مرکزی حکومت نے عمل نہیں کیا۔ ملت کی طرف سے بھی اس معاملہ کو نہیں اٹھایا گیا۔

یہ بھی جان لینا بہت ضروری ہے کہ پورے ملک میں مرکزی، صوبائی، ضلعی و مقامی سطح پر روز دسیوں ہزار فیصلے ہوتے ہیں اور ان میں سے 95% کارروائیوں میں اوپر سے نیچے تک کسی مسلمان کا کوئی رول نہیں ہوتا ہے۔ یہ تمام فیصلے مسلمانوں کی غیر موجودگی میں اور بغیر مسلمانوں کے مفاد کو ذہن میں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ دراصل مسلمان کسی گنتی میں آتے ہی نہیں ہیں، لیکن افسوس کہ روزمرہ کی اس ملک گیر فیصلہ سازی میں اپنی غیر موجودگی کے لئے ملت خود ذمہ دار ہے۔ پورے ملک کی انتظامیہ کا کنٹرول چند ہزار افسر شاہوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ مرکزی و صوبائی پبلک سروس کمیشنوں کے تحت منعقد سالانہ مقابلہ جاتی امتحانوں کے ذریعہ منتخب کئے جاتے ہیں۔ ان اعلیٰ افسروں میں اوسطاً ڈھائی فیصد سے زیادہ مسلمان نہیں ہوتے ہیں، جبکہ مردم شماری کے بموجب مسلمانوں کی قومی آبادی ملک میں 13.4% ہے اور متعدد صوبوں میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ کشمیر میں 67%، آسام میں 31%، مغربی بنگال میں 25.2%، کیرالا میں 24.7%، یوپی میں 18.5% اور بہار میں 16.5% ہے۔

لیکن یہاں ایک نکتہ جاننا بہت ضروری ہے۔ سچر کمیٹی نے اپنی ملک گیر مستند تحقیق کے ذریعہ یہ بھی پتہ لگایا تھا کہ مندرجہ بالا مقابلہ جاتی امتحانات میں امیدواروں کی فہرست میں مسلمان ہمیشہ ایک فیصد سے کم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی بات غور کرنے کی ہے کہ اگر ان امتحانوں میں مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اثر ہوتا تو آزادی کے بعد سے چار دفعہ آئی اے ایس میں مسلمان امیدوار سرفہرست نہ آتا، بلکہ یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ایسا صرف باقاعدہ و زبردست محنت سے ممکن ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مسلمانوں کو ان کی زبوں حالی سے باہر نکالنے کیلئے کیا کیا جانا چاہئے۔ ذہن نشیں کر لیجئے کہ آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی آر ایس، آئی ایف ایس وغیرہ سول سروسز میں مسلمانوں کو ایک پلان کے تحت شامل کروانے کا اولین مقصد انھیں ذاتی طور پر برسر روزگار کروانا نہیں ہے۔ لہٰذا دیگر ملازمتوں سے ان کا موازنہ نہ کیا جائے۔ سول سروسز میں مسلمانوں کو شامل کروانے کا مقصد ہے ملک کی حکمرانی میں ملت کی حصہ داری کا حق بحال کروانا۔

خدا کا شکر ہے کہ یہ ایک راستہ ہے جو اب بھی کھلا ہوا ہے۔ آپ کے ذہن میں آسکتا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ سبھی مسلمان افسر شاہ مسلمانوں کے بہی خواہ ہوں۔ تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے شجاعت پرست ملک میں ماتحت سرکاری عملہ کے لوگ اپنے اعلیٰ افسر کی خوشنودی کو اولین ترجیح دیتے ہیں اور اس کے بغیر کہے ہوئے بھی اس کے خاندانی اور طبقاتی مفاد پر بھی آنچ نہ آنے دینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ ماتحت عملہ کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی ملازمت کا مفاد ایسا ہی کرنے میں ہے۔ آپ کے ذہن میں یہ بھی آسکتا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمان افسر ایمانداری سے اپنا کام کریں۔ دو باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک دو مثالوں کی بنیاد پر پورے نظام کو آنکنے میں زیادہ عقلمندی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ خراب سے خراب صورت حال میں سطح ایمانداری تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے افسروں میں ایک مشترک جز سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ پھر بھی ہم وزنیِ موافقت یہی اشارہ کرتی ہے کہ ملت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کے نمائندے سرکاری فیصلہ ساز انتظامیہ میں ملت کی آبادی کے تناسب سے شامل رہیں۔ اس مقصد کی حصولیابی کیلئے اکابرین ملت کو طویل مدتی بے غرض منصوبہ بندی اور ادارہ سازی کرنی ہوگی اور اس کیلئے قُلِ العَفُوُ کے حکم خداوندی (2.219) کو بروئے کار لانا ہوگا۔ یہ کام مشکل نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا:

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن
یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

info@zakatindia.org

Published in 05 Jul-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

نوا پیرا ہو اے بلبل...

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”میں صرف اتنا عرض کر رہا ہوں کہ شرعی احکامات پر ہمیں ثابت قدم رہتے ہوئے، اپنی عقل و علم کا استعمال کرتے ہوئے، صرف خوف خدا کرتے ہوئے اور کسی اور سے نہ ڈرتے ہوئے حق گوئی ضرور کرنی چاہیے اور بہ تکرار کرنی چاہیے اور اس کا اثر اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے تو کامیابی ضرور ملتی ہے۔ بہرحال نیوٹن کے نام سے منسوب قدرتی قانون تحریک بھی یہی کہتا ہے کہ ہر حرکت کا معقول اثر تو ہوتا ہی ہے۔“

سورہ آل عمران کی آیت 159 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کی رائے ضرور سنے، لیکن اس کے بعد اللہ کی دی ہوئی عقل اور اس کے دیے ہوئے علم کا استعمال کر کے خود اپنی رائے قائم کرے اور پھر اس پر مستحکم رہے، اس میں اللہ ضرور اس کی مدد کریں گے۔ اس احکام ایزدی کی روشنی میں انسان جو مناسب سمجھتا ہے اسے دیگر انسانوں سے بے خوف ہو کر، ہاں اللہ سے خوب ڈرتے ہوئے، مسلسل کہتے رہنا چاہیے، اس میں اثر ڈالنا اللہ کا کام ہے۔ اس قرآنی حکم کی تشریح میں علامہ اقبال کا کہنا ہے:

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

حال میں مجھ سے خاندان کے ایک فرد نے کہا کہ میرے خطبات وتخلیقات میں کبھی ایشو کی تکرار بھی ہوتی ہے، اس پر میں نے گہرائی سے غور کیا تو اس کے فوائد سمجھ میں آتے ہوئے نظر آئے۔ 11/ مارچ 2012 کو دہلی کے ذاکر حسین کالج کے آڈیٹوریم میں ایک بڑے مجمع میں اس وقت کے مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل کے لیے تہنیتی پروگرام منعقد ہوا تھا، منتظمین نے مجھے مدعو کیا تھا تاکہ میں سچر کمیٹی کی رپورٹ کے نفاذ کے بارے میں اعداد وشمار پیش کروں۔ اس وقت اپنی تقریر کے دوران میں نے وزیر موصوف سے حق گوئی کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمانوں کی تعیناتی کو ان کی حکومت نے مسلمانوں کے پیدا کردہ یا ان کے لیے بنائے گئے اداروں مثلاً مرکزی وقف کونسل، صوبائی وقف بورڈ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو یونیورسٹی وغیرہ تک ہی کیوں محدود کر رکھا ہے۔ وہ انھیں مرکزی خزانہ سکریٹری، مرکزی ہوم سکریٹری، پلاننگ کمیشن کا وائس چیئرمین، آئی بی کا ڈائریکٹر، دہلی کا لیفٹیننٹ گورنر وغیرہ عہدوں پر کیوں تعینات نہیں کرتی ہے۔ اس کے بعد 13/اپریل 2012 کو انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کی جانب سے دہلی کے کانسٹیٹیوشن کلب میں سچر کمیٹی اور مشرا کمیشن کی رپورٹوں کے نفاذ کے فقدان پر کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں پیش کردہ میرا پاور پوائنٹ پرزنٹیشن اب بھی یوٹیوب پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دیگر تجزیاتی عرضداشتوں کے علاوہ میں نے زور دے کر دوبارہ کہا تھا کہ حکومت وقت مسلمانوں کی تعیناتی صرف اقلیتی کمیشن، جامعہ ملیہ وعلی گڑھ، حج کمیٹی، اردو اکیڈمی وغیرہ تک ہی محدود کیوں رکھتی ہے، وہ انھیں پلاننگ کمیشن کا وائس چیئرمین، دہلی کا لیفٹیننٹ گورنر وغیرہ کیوں نہیں بناتی۔ اس کے علاوہ یہی ایشو میں نے متعدد دیگر تقاریر وتحریروں میں اٹھایا تھا۔ بہرحال تب سے اب تک ایک مسلمان دہلی کا لیفٹیننٹ گورنر اور ایک آئی بی کا چیف بن چکا ہے۔ میں بالکل اپنے سر سہرہ نہیں لے رہا ہوں، لیکن صرف اتنا عرض کر رہا ہوں کہ شرعی احکامات پر ہمیں ثابت قدم رہتے ہوئے، اپنی عقل وعلم کا استعمال کرتے ہوئے، صرف خوف خدا کرتے ہوئے اور کسی اور سے نہ ڈرتے ہوئے حق گوئی ضرور کرنی چاہیے اور بہ تکرار کرنی چاہیے اور اس کا اثر اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے تو کامیابی ضرور ملتی ہے۔ بہرحال نیوٹن کے نام سے منسوب قدرتی قانون تحریک بھی یہی کہتا ہے کہ ہر حرکت کا معقول اثر تو ہوتا ہی ہے۔

بعدازاں 29/جون 2013 کو میں نے احمد آباد کے ایک جلسہ بعنوان 'جوابدہ حکمرانی' میں موجودہ وزیراعظم کے سامنے 30 منٹ کا پاور پوائنٹ پرزنٹیشن کیا تھا، جس میں ان سے بھی حق گوئی کی تھی، میں نے جو ایشو ان کے سامنے رکھے تھے، اس میں سے دو تو انھوں نے دیر سویر سے مان کر ان کا نفاذ بھی کر دیا اور باقی ایشوز ان کے ضمیر پر اثرانداز تو ہوتے ہی رہیں گے، گو کہ مکمل اثر ڈالنا تو اللہ کے ہاتھ میں ہمیشہ ہی رہے گا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی رواں ہفتہ کے دوران نظر میں آئی، ملت کی ایک نوزائیدہ تنظیم نے مجھے اپنا ٹرسٹی بنالیا، تنظیم اللہ کی منظور نظر ایسی شخصیت کی یاد سے منسوب ہے، جن سے ہمیشہ میرا عشق مجازی کا رشتہ رہا تو میں منع بھی نہیں کر پایا، حالانکہ میرے پاس الحمدللہ وقت کی ہمیشہ تنگی رہتی ہے۔ لیکن اگر بنیادی اصولوں سے پرے کہیں کوئی پیش رفت ہو تو اس کو درست کرنے کے لیے ضروری مداخلت کرنے کا تو اللہ کا حکم ہے، ورنہ ہمیں اس غیر معقولیت کا حصہ تسلیم کیا جائے گا۔ لہٰذا میں نے اپنے واجب اعتراضات اور تجاویز کا اظہار بہ تکرار کر دیا، نتیجتاً الحمدللہ میرا مرکزی خیال منظور کر لیا گیا، امید ہے کہ اب زیادہ بہتر طریقے سے تنظیم کا کام چلتا رہے گا۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر طارق منصور نے سول سروسز کے لیے علی گڑھ کی رہائشی کوچنگ اکیڈمی کے کام کا جائزہ لینے کا موقع مجھے فراہم کیا۔ اکیڈمی کے موجودہ ڈائریکٹر خود 1988 میں سول سروسز امتحان میں شامل ہو کے کامیاب ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ٹریننگ کے بعد چند ماہ حکومت ہند میں کام بھی کیا، اس وجہ سے وہ خوب واقف ہیں کہ سول سروسز میں کامیابی کے لیے کیا تگ و دو کرنی ہوتی ہے۔ پریلمنری امتحان 2018 میں جو امیدوار شامل ہوئے ہیں، ان کی کامیابی کی دعا ہے۔ یونیورسٹی کے ہر شعبے میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر دوسرے سمسٹر میں پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے تمام طلبا وطالبات کو جمع کر کے ان سے ہم لوگ ان شاء اللہ شروع اگست میں تلقینی گفتگو کریں گے، ساتھ ہی اگلے بیچ کے لیے اشتہار ملک گیر اشاعت والے اردو اخبارات میں دیے جائیں گے، سالانہ ایکشن پلان اور عنوان وار تدریسی پلان تیار کیے جائیں گے، امید ہے کہ اکیڈمی کی کارکردگی مزید بہتری کی طرف گامزن ہوگی۔ ادھر سچر کمیٹی کے سابق ممبر سکریٹری ماہر اقتصادیات ڈاکٹر ابوصالح شریف ملی حقوق کی بارآوری کے لیے مؤثر اقدامات کرتے رہے ہیں۔ اپنے صوبہ کرناٹک میں حالیہ اسمبلی الیکشن کے دوران انھیں معلوم ہوا کہ تقریباً ایک تہائی مسلم ووٹروں کا نام الیکشن کمیشن کی فہرست میں نہیں تھا۔ انھوں نے فوراً ہی ٹیم بنا کے بوتھ سطح پر کام شروع کر دیا، وہاٹس ایپ پر انھیں سیکڑوں رضاکاروں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ قلت وقت کے باوجود کم عرصے میں ہی لاکھوں نئے ووٹرس رجسٹر ہو گئے۔ اب 2019 کے الیکشن کے پیش نظر یہی مشق یوپی، بہار، مغربی بنگال وغیرہ میں کرنے کے لیے وہ پابرکاب ہیں۔ الیکشن کمیشن کی ویب سائٹ سے ہر انتخابی حلقہ کے ووٹروں کی فہرست ڈاؤن لوڈ کر کے اسے پی ڈی ایف سے تحریری عبارت میں تبدیل کروانا، اس میں غیر موجود ناموں کی شناخت کرنا اور پھر ان ووٹروں تک پہنچ کر ان سے فارم بھروا کے انھیں ووٹر بنوانا، امید ہے کہ افراد ملت ان کی امداد کریں گے۔

شہریوں کے قومی رجسٹر کی تکمیل کی تاریخ قریب آنے پر اقوام متحدہ کے پانچ روئداد نویسوں (UN Reporters) نے وزیر خارجہ سشما سوراج کو لکھا ہے کہ ہندوستان کو چاہیے کہ وہ حقوق انسانی سے متعلق بین الاقوامی ضابطوں و معیاروں کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھائے۔ اس رجسٹر میں آسام میں رہائش پذیر ہندوستانی شہریوں کے ناموں کا تازہ اندراج ہونا ہے اور اگر کوئی غیر ملکی وہاں رہ رہا ہے تو اس کا نام رجسٹر سے خارج کیا جانا ہے۔ اس طور پر جو لوگ خارج کر دیے جائیں گے، ان کا آگے کیا ہونا ہے اس کے لیے کوئی سرکاری پالیسی نہیں بنی ہے۔ ایسا سننے میں آیا ہے کہ ان کی شہریت کے حقوق ختم کر دیے جائیں گے اور انھیں غیر ملکی سمجھا جائے گا، جبکہ ایسا کرنے سے پہلے ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا اور نہ ہی انھیں پیروی کا موقع ملا۔ روئداد نویسوں نے کہا کہ آسام میں بنگالی مسلم اقلیت کے پاس شہریت کے دستاویزی ثبوتوں کے باوجود بدظنی کی وجہ سے ان کو عرصہ دراز سے تعصب کا سامنا کرنا پڑتا رہا ہے، جس کی وجہ سے وہ بیچارے ہمیشہ بیجا الجھن کا شکار رہتے ہیں۔ روئداد نویسوں نے تشویش ظاہر کی کہ آسام میں متعلقہ سرکاری افسر مسلمانوں و بنگالی نسل کے لوگوں کے خلاف مخصوص عداوتی رویہ رکھتے ہیں، وہ ساز باز کر کے تصدیق و تصحیح کے سسٹم میں جوڑ توڑ کے ذریعہ مستند شہریوں کو شہریت کے رجسٹر سے خارج کر سکتے ہیں، اس کی طرف وزیر خارجہ کو توجہ دینی چاہیے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 12 Jul-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

مومن کا خمیر عشق لاتخف سے بنتا ہے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

"عشق کا موازنہ عقل سے کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ پیغام خداوندی موصول ہوتے ہی عشق اس پر عمل کرنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے، جبکہ عقل اس پیغام کے معنی سمجھنے میں ہی کافی وقت لگا دیتی ہے۔ اسی عشق کا اظہار تھا کہ حضرت ابراہیمؑ بے جھجک آگ میں کود پڑے تھے، جبکہ وہاں درباری اس عزم مصمم کو سمجھنے سے قاصر رہے۔"

علامہ اقبالؒ رموز دین مصطفوی بیان کرتے ہیں کہ اگر انسان اپنی خودی کو آشکار کرے تو وہ اپنے کو کسی شہنشاہ یا سلطان سے کم محسوس نہیں کرے گا، اپنی ذات کے اسرار کو جان لینا ہی دین ہے۔ جو شخص خودشناس بن جاتا ہے وہ اوروں پر سبقت لے جاتا ہے اور ضمیر عالم سے بھی باخبر ہو جاتا ہے، اس طور پر وہ پیغمبروں کا وارث بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنی ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے اور اس کے لیے اگر ضرورت پڑے تو اس جہان کہنہ کو تہہ و بالا بھی کر سکتا ہے۔ گو کہ وہ دنیا میں قیام پذیر ہوتا ہے لیکن وہ اپنے لیے ہمہ جہت راستے کھوج لیتا ہے، جس کا جواز لوگوں کے لیے عام زندگی میں سمجھ پانا آسان نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی اڑان کو دنیا تسلیم کرنے لگتی ہے کیونکہ وہ سورج کو بھی صرف گرد راہ ہی سمجھتا ہے۔ حب ملت سے وہ اپنی فطرت کی آرائش کرتا ہے اور اسی سے وہ اپنے نور میں اضافہ کرتا ہے۔ مرد کامل کی یہ صفات بیان کرنے کے بعد علامہ ہر بندۂ مومن سے کہتے ہیں کہ وہ قرآن کریم و حدیث کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کی روشنی میں اپنے ضمیر کو کریدے اور اس طرح خود اپنی شناخت کرلے۔ معلوم ہوگا کہ اس کائنات کا تمام نظام وحدت پر ہی قائم ہے، جبکہ ہم اس سے اپنے کو دور کیے ہوئے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دلوں میں نئی آرزوؤں کو جنم دیتے رہیں، ہمارے کان، آنکھ، عقل سب آرزو سے ہی تیزی پاتے ہیں، اسی کی وجہ سے خاک سے گل لالہ پیدا ہوتا ہے اور اگر کسی کے دل میں آرزو جنم نہیں لیتی ہے تو وہ زمانہ کی ٹھوکروں کی زد میں آجاتا ہے، لہٰذا ترقی کے لیے سعی پیہم کو اپنانا ہی ہوگا۔ اقبالؒ کا مشہور جملہ ہے کہ میں نے قرآن کریم کے ضمیر میں آب حیات پوشیدہ پایا ہے، وہی ہمیں اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے کا سبق سکھا دیتا ہے۔ بقول ماہر اقبالیات ڈاکٹر طاہر فاروقی، اقبالؒ کے مطابق تقلید نبویؐ میں ڈوب جانے کا نام ہی دیدار رسولؐ ہے۔ یہ غلامی دراصل آزادی ہے کیونکہ احکام نبوی کو فطرت صحیح خود بخود قبول کرتی ہے۔ عشق رسولؐ کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل اقبالؒ سمجھاتے ہیں کہ لفظ عشق قرآن کریم و حدیث میں نہیں آیا ہے، وہاں اس کی جگہ حب کا لفظ استعمال ہوا ہے، دراصل تمام کائنات اس جذبہ مقناطیسی سے سرشار ہے مع غیر ذی روح اشیا کے مثلاً زمینی محبت کو کشش کا نام دیا گیا ہے، انسانوں میں یہی جذبہ پاکیزگی کے اعلیٰ درجے میں پہنچ کر عشق کہلانے لگتا ہے۔ یہی دم جبرئیلؑ ہے، اسی کی مستی سے زندگی تابناک رہتی ہے، زندگی کے تار عشق کی مضراب سے رواں ہوتے ہیں۔

عشق کا موازنہ عقل سے کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ پیغام خداوندی موصول ہوتے ہی عشق اس پر عمل کرنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے، جبکہ عقل اس پیغام کے معنی سمجھنے میں ہی کافی وقت لگا دیتی ہے۔ اسی عشق کا اظہار تھا کہ حضرت ابراہیمؑ بے جھجک آگ میں کود پڑے تھے، جبکہ وہاں درباری اس عزم مصمم کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اگر عقل مصلحت اندیش ہو تو پختہ کہلاتی ہے لیکن دیار عشق میں مصلحت کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ مثنوی رموز بے خودی میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ مومن کا خمیر عشق سے بنتا ہے، عشق کو لاتخف کا یقین محکم حاصل ہوتا ہے۔ ان کے مطابق اگر عشق کی رہنمائی عقل کو حاصل ہو اور عشق کو عقل کا تعاون تو دونوں مل کے ایک نئی دنیا تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ علم کا مقام تسلیم کرتے ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ عشق کی جرأت رندانہ ہی ہر دنیاوی رکاوٹ کو سرنگوں کر دیتی ہے۔ عشق کا ہی ایک آلہ ہے فقر جو قلب و نگاہ کو پاکیزگی بخشتا ہے، علم مقام خبر ہے فقر مقام نظر۔ جب تیغ خودی فقر کی سان پہ چڑھتی ہے تو بڑے سورماؤں کو تاراج کر دیتی ہے۔ اسی ضمن میں اقبالؒ کا ایک اور منفرد تصور ہے، جسے وہ حضوری کہتے ہیں یعنی مالک کائنات کے سامنے اپنے وجود کا احساس، اقبالؒ عقل کے معتقد ہیں لیکن کہتے ہیں کہ اس کی تقدیر میں حضوری نہیں ہے۔ اسی لیے وہ دل بینا کی وکالت کرتے ہیں، کیونکہ بقول ان کے آنکھ کے نور پر دل کے نور کو سبقت ہوتی ہے۔ عقل اس پتھر کی مانند ہے، جسے عشق چمکا کے آئینے میں تبدیل کر سکتا ہے، اہل ہنر کو ید بیضا کا معجزہ عشق ہی دلاتا ہے، تخلیق کرنا عشق کا ہی پرتو ہے۔ بقول اقبالؒ، ذرا تم دل کے غار حرا میں خلوت نشینی اختیار کرو، اپنے ہوائے نفسانی کو ترک کرو اور حق کی جانب ہجرت کرو، تب تم معرفت نفس کے مدارج طے کر سکوگے، رب کی نوازشیں تم پر نازل ہوں گی اور وہ تمھیں اپنی نیابت کے منصب پر فائز کر دے گا۔

سلسلہ تفویض عالم میں ایک مقام آیا جب انسان کے ذہن و عقل اور اس کی دیگر قوتوں کا پیمانہ ایک خاص سطح تک پہنچ گیا، تب پروردگار نے حضور اکرمؐ کو رسالت پر مبعوث کر دیا۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ مجھے مبعوث کیا گیا ہے تاکہ میں بہترین اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچاؤں۔ حدیث شریف کے مطابق حسن اخلاق اللہ کا خلق عظیم ہے۔ اسی لیے تعلیم دی گئی کہ تمام مومنوں کو خدا جیسے اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام مراتب میں رسول اکرمؐ کا مقام اعلیٰ ترین ہے۔ ساتھ ہی ہم انسانوں کو نفس، آفاق اور کل کائنات پر سبقت لے جانے کی سعی کا حکم ملا ہے، اس کی تکمیل پر ہی انسان مرد مومن بنتا ہے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ اگر رسول اکرمؐ کی ذات اقدس وجود میں آنے والی نہ ہوتی تو یہ کائنات بھی موجود نہیں ہوتی، اسی کرشمہ کے لیے اقبالؒ نے لولاک کی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ جب انسان عالم رنگ و بو پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے تب کائنات کے اسرار اس پر کھلنے لگتے ہیں اور وہ اپنی صحیح صلاحیتوں سے باخبر ہونے لگتا ہے۔ انسانی غلبہ کے اس حصول کے باوجود مرد مومن کا خمیر اسے یاد دلاتا رہتا ہے کہ محبت اس کی شخصیت کا اہم حصہ ہے، وہ شمع محفل کی طرح سب سے جدا اور سب کا رفیق بن کے رہتا ہے۔ اس کی گفتگو ظاہری طور پر سادہ لیکن معنی میں دقیق ہوتی ہے اور اس کا انداز زمانہ سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کا دل زندگی سے بھرپور لیکن ساتھ ہی قرآنی اصطلاح میں قلب سلیم ہوتا ہے اور وہ رنگ الٰہی میں ملبوس ہو کر صبغت اللہ کے مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔

حضرت آدمؑ پر تخلیق کائنات کا اختتام ہوا اور حضور اکرمؐ پر تکمیل انسانیت کا، مرد مومن انھی بصیرتوں کا مظہر ہوتا ہے، تدبیر و تقدیر اس کے ماتحت ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ مومن وہ نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے، یہ ایک قوت نورانیہ ہے کہ جامع ہے جواہر موسویتؑ اور ابراہیمیتؑ کی، اس کا دائرۂ اثر تمام طبعی تناقضات پر حاوی ہے، وہ حق تعالیٰ سے رنگ و بو حاصل کرتا ہے، ہر لحظہ ایک نئی شان اس میں مضمر ہوتی ہے، وہ مقام محمدیؐ کا ادراک حاصل کر کے رتبہ عبدیت کے انجام تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اقبالؒ کو شکایت ہے کہ ملت اب شعار نبویؐ سے دستبردار ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ زوال پذیر ہے۔ پہلے مومن بکری کی طرح شیر کا شکار کرتا تھا، اس کی تکبیر سے پتھر پانی ہو جاتا تھا، اس کا عزم پہاڑ کو تنکا سمجھتا تھا، اس کے اقدامات سے نئے حوصلے جنم لیتے تھے، لیکن اب وہ سعی و جستجو ترک کر کے قناعت کے نام پر کشکول گدائی لیے بیٹھا ہے۔ علامہ اقبال تلقین کرتے ہیں کہ ہمارا برگ و ساز سب کتاب و حکمت ہے، اسی سے ہمیں عزم و آبرو کا حصول ممکن ہے، وہی مومن کو جمالی و جلالی شان کا امتیاز مہیا کرتی ہیں۔ قرآنی تعلیمات سے ہم لاتخف کی کیفیت میں ڈوب سکتے ہیں، اسی آئین الٰہی کی پابندی سے کونپل پھول بنی، پھول گلدستہ بنے، آواز نغمہ بنی، ہوا سانس بنی۔ خیال رہے کہ کلام الٰہی میں سیکڑوں نئے عالم اور نئے زمانے پوشیدہ ہیں، اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے اقبال یاد دلاتے ہیں کہ زمین کی ملکیت خدا کی ہے اور بندے امانت دار بن کے اس میں تصرف کرتے ہیں، بنی آدم کو ایک ہی دسترخوان سے روٹی و پانی میسر آتا ہے، تم وہ ضرورتمندوں پر خرچ کرو جو تمھیں عزیز ہے، جو کچھ تمھارے پاس ضرورت سے زیادہ ہے، وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔ خود احتسابی اور ساری کائنات کا احتساب فقر کی شان ہے وہ تسلیم و رضا کا منبع ہے جس سے مومن شش جہات کو تسخیر کر لیتا ہے، وہ اپنی خودی کو حق کی کسوٹی پر لگا کر اسے دلیل راہ بناتا ہے، بال جبریل میں وہ کہتے ہیں:

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 19 Jul-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

موجودہ سستی سیاست بنام ملی حکمت عملی

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”مثبت ادارہ سازی کے ان دو دھاروں کے ساتھ اگر خطبات جمعہ کے ذریعہ ملی تربیت کا بھی ملک گیر ادارہ ساز نظام قائم ہو جائے تو ان شاء اللہ آنے والی نسلیں ہم سے خوش ہوں گی کہ ہم نے کرۂ ارض پر اپنے قیام کا استعمال مالک حقیقی کی منشا کے مطابق کیا۔ بی جے پی کو راہل گاندھی کی مسلمانوں سے ملاقات پر سستی سیاست کرنے میں ہی الجھے رہنے دیجیے۔“

بھلا ہو راہل گاندھی کا کہ انھوں نے مسلمانوں سے ان کے حقوق کی بازیابی سے متعلق گفتگو کی، گو کہ ان کی اس نیک کاوش کو فرقہ واریت کا رنگ دینے کے لیے بی جے پی نے خوب کھیل کھیلا۔ اصل میں بی جے پی سوچتی ہے کہ ہندوواد سیاست پر صرف اسی کا حق ہے، اس لیے وہ راہل گاندھی کے ہندو ہونے پر سوال اٹھاتی رہتی ہے، کانگریس کو مجبوراً بتانا پڑا کہ راہل جنیو دھاری ہندو ہیں۔ پھر جب مسلمانوں سے ان کی ملاقات ہوئی تو بی جے پی کے نمائندے نے معنی خیز انداز میں پوچھا کہ وہ جنیو دھاری ہیں کہ مسلم دھاری، گویا اس نے شرافت کی سب حدیں پار کر دیں، چار برس سے ملک میں ماحول ہی ایسا بنا دیا گیا ہے کہ ہر ایشو کو ہندو بنام مسلم کے ترازو میں تولنے میں بی جے پی کو مزہ آتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ اسی سے اس کے ووٹ پکے ہوں گے، حالانکہ حالیہ وسط مدتی انتخابات میں ان کی یہ پالیسی فیل ہوتی نظر آئی، لیکن پھر بھی وہ اپنی پالیسی بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بحث کے دوران ایک ٹی وی اینکر نے اسکائپ کے ذریعہ میرا تجزیہ معلوم کیا کہ بی جے پی نے مسلمانوں سے راہل کی ملاقات پر بات کا بتنگڑ کیوں بنایا ہے تو میں نے کہہ دیا کہ 2014 کا الیکشن جیتنے کے بعد وزیراعظم نریندر مودی نے لوک سبھا میں اپنی پہلی تقریر میں مانا تھا کہ باقی مذاہب کے ماننے والوں کے مقابلے میں مسلمان سماجی، اقتصادی اور تعلیمی میدانوں میں سب سے پیچھے ہیں، اس لیے ان کے لیے مخصوص اسکیمیں بنانی ہی ہوں گی، اس کے چار برس بعد اب بحث اس پر ہونی چاہیے کہ وزیراعظم کے اس عزم پر اس دوران کتنا عمل ہوا، لیکن کیونکہ اس پر عمل ہی نہیں ہوا، ہاں لنچنگ ہوتی رہی، اس لیے اس اہم ایشو کو اپنے سیاسی مفاد کے مد نظر خارج از بحث کرنے کے لیے انھوں نے راہل گاندھی کی مسلمانوں سے ملاقات کو فرقہ واریت کے رنگ میں رنگ دیا۔

ٹی وی اینکر نے یہ بھی پوچھا کہ مسلمانوں کے بیک ورڈ ہونے کی اصل وجہ کیا ہے اور میرا ردعمل جاننا چاہا منموہن سنگھ کے 9/دسمبر 2006 کے بیان پر کہ ملک کے وسائل پر مسلمانوں کا پہلا حق ہونا چاہیے تو میں دل میں علامہ اقبال کا مصرع گنگنانے لگا: ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا۔ اصل بات یہ ہے کہ 1950 کے صدارتی حکم نامہ کے ذریعہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو شیڈولڈ کاسٹ کی تعریف سے خارج کر دیا گیا تھا اور تبھی سے غیر دستوری طور پر دھرم کی بنیاد پر ہی ریزرویشن دیا جا رہا ہے، جس کا خمیازہ مسلمان گزشتہ ستر برس سے بھگت رہے ہیں۔ یہ جواب بی جے پی و آر ایس ایس کے ترجمانوں کو راس نہیں آیا، لیکن الحمدللہ میں نے ایک دفعہ پھر حق گوئی کا فریضہ انجام دیا۔ اس سلسلہ حوادث کی بڑی تصویر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار کا سارا کھیل حکمرانی حاصل کرنے اور اس کو قائم رکھنے کا ہے۔ بیسویں صدی کی شروعات میں اس وقت کے سارے مثبت سیاسی ایشوز پر کانگریس کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے جو لوگ سیاسی تمنائیں رکھنے کے باوجود کانگریس میں محورانہ رول حاصل نہیں کر سکے، انھیں لگا کہ کچھ تو ایسا الگ کرنا چاہیے جس سے لوگوں کے جذبات بھڑکا کے ایک جداگانہ سیاسی پلیٹ فارم تیار ہو جائے، لہٰذا مسلمانوں کے خلاف صدیوں پرانی تعصب کی چنگاری کو آتشزن کیا گیا، وہی دیرینہ چنگاری جو اس وقت قومیت کی راکھ میں تقریباً دب چکی تھی، اب 2018 میں سماجی شعلہ بنی ہوئی ہے، جس میں چند لوگ سیاسی مفاد کی روٹیاں سینک رہے ہیں۔ ان کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ملک کے کروڑوں نونہالوں کے اعصاب پر اس کا منفی اثر پڑے گا، ان کی ذہنیت خراب ہو جائے گی، وہ بڑے ہو کر تشدد پرست بن جائیں گے، سماج میں بٹوارے کو فروغ ملے گا، انسانی قدریں گرنے لگیں گی، انسانیت کا طویل مدتی نقصان ہوگا۔ لیکن ان چنندہ سیاستدانوں کو اپنے نقطہ تنگ نظر کے آگے کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ میڈیا میں یہ بھی آیا کہ راہل کی میٹنگ میں پروفیسر عرفان حبیب نے کہا کہ کانگریس کو فی الوقت مسلم مفادات پر گفتگو نہیں کرنی چاہیے، میں ان سے متفق ہوں۔ چار برسوں میں ملک کا ماحول اس قدر بگڑ گیا ہے کہ کانگریس کو اپنی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اپنی حکمت عملی سوچ سمجھ کے طے کرنی ہو گی۔ ادھر مسلمانوں کو بھی کانگریس کی اس وقتی پریشانی کو سمجھنا ہوگا، ایک مرتبہ وہ ظلمت شب سے باہر آ جائے پھر ملت اس پر اپنا حق جمانے کا سوچ سکے گی۔

ادھر امریکہ کے مختلف صوبوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طلبا و طالبات کی تنظیمیں ماشاء اللہ ملت کے تئیں بڑی متفکر و فعال ہیں۔ وہاں ان تمام تنظیموں کا وفاقی سطح پر بھی اچھا نظم و نسق ہے اور سال بھر کے پروجیکٹس کی پلاننگ اور ان کے نفاذ کی غرض سے باہمی سبق آموزی اور تعاون پر غور و خوض اور گفت و شنید کے لیے وہ لوگ سالانہ کنونشن کرتے ہیں، جس کا سترہواں اجلاس گزشتہ ہفتہ ہیوسٹن میں منعقد ہوا۔ اس فیڈریشن کا افتتاحی اجلاس 2001 میں واشنگٹن میں ہوا تھا، میں ان دونوں جگہوں پر دونوں اجلاس میں موجود تھا۔ واشنگٹن والے اجلاس میں پیش کردہ میرے پاور پوائنٹ پرزنٹیشن سے تلقین حاصل کر کے نیویارک میں قیام پذیر کرناٹک کے وہاج اظہر نے اپنے وطن بیجاپور میں نویں درجہ سے ہی علاقہ کے قابل ترین بچوں کے سالانہ تعین، ایک جگہ مخصوص ہوسٹل میں ان کی رہائش اور مستقبل میں سول سروسز میں شمولیت کے لیے ابھی سے ان کی طویل مدتی تیاری کا معقول انتظام کر رکھا ہے، تیسرا بیچ چل رہا ہے۔

اب ہیوسٹن میں منعقد تازہ کنونشن کے دوران میں نے حاضرین کو آگاہ کرایا کہ ہمارے ملک عزیز کے شہری و دیہی علاقوں میں مقیم بیس ہزار سے زائد لوکل باڈیز میں مسلمانوں کے حقوق کی ستر برس سے چلی آ رہی مستقل باضابطہ پامالی کے سلسلہ پر قابو پا کر اس بہاؤ کی سمت بدلنے کے لیے ایک حد بندی اکیڈمی اور حد بندی کارکنوں کے کیڈر کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے مسلم یونیورسٹی کے دسیوں ہزار سابق طلبا امریکہ کے پچاس صوبوں میں سے ہر ایک میں برسر روزگار ہیں، ان کی صوبے وار تنظیموں کے نمائندے اس سالانہ وفاقی کنونشن میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ میرا پیغام انفرادی اراکین تک بھی پہنچ رہا ہے۔ اسی طرح خاموشی سے ملت کو سلسلہ وار ٹھوس ادارہ سازی کرتے رہنی چاہیے۔ اللہ نے مولانا محمود مدنی کے دل میں سول سروسز کے لیے زیڈ ایف آئی کے ساتھ تعاون کی اہمیت ڈال ہی دی ہے۔ مثبت ادارہ سازی کے ان دو دھاروں کے ساتھ اگر خطبات جمعہ کے ذریعہ ملی تربیت کا بھی ملک گیر ادارہ ساز نظام قائم ہو جائے تو ان شاء اللہ آنے والی نسلیں ہم سے خوش ہوں گی کہ ہم نے کرۂ ارض پر اپنے قیام کا استعمال مالک حقیقی کی منشا کے مطابق کیا۔ بی جے پی کو راہل گاندھی کی مسلمانوں سے ملاقات پر سستی سیاست کرنے میں ہی الجھے رہنے دیجیے۔

❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 26 Jul-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

اوقاف سے متعلق وزارت اقلیتی امور کا خط

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں قدیم جائیدادیں اس وجہ سے دی جاتی ہیں کہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو اور وہ قائم و دائم رکھی جائیں، لیکن محکمہ کی اندیکھی اور لاپروائی اب ملک میں کہاوت بن چکی ہے۔ ابھی حال میں ہی تاج محل کے تئیں لاپروائی برتنے کے لیے بھی سپریم کورٹ کو حکومت کی سرزنش کرنی پڑی۔ سب جانتے ہیں کہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل والی مساجد و خانقاہوں میں خوب خوب ناجائز قبضے ہیں اوران کی بے حرمتی ہوتی ہے۔“

اقلیتی امور کے مرکزی وزیر مختار عباس نقوی کو میں نے یکم جون 2018 کو خط لکھ کر ان کی توجہ دلائی تھی کہ ہریانہ وقف بورڈ نے گڑگاؤں کے ضلع انتظامیہ کو وہاں 19 ایسی وقف املاک کی فہرست دی ہے، جہاں نماز اس وجہ سے نہیں ہوتی ہے کیونکہ مقامی افراد اس پر معترض ہیں یا انھوں نے ان جائیدادوں پر ناجائز قبضہ بھی کر رکھا ہے۔ اس کے برخلاف وسط مئی میں گڑگاؤں میں کچھ مقامات پر سڑک کے کنارے زمین کے غیر مستعمل خطوں پر نماز جمعہ کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ دوسری طرف ہریانہ کے وزیراعلیٰ نے بیان دیا کہ اگر کچھ لوگوں کو سڑک کے کنارے نماز پڑھے جانے پر اعتراض ہے تو اس ایشو پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیے۔ یہ تشویش بالکل واجب ہے لیکن اس سے منسلک اور اتنا ہی ضروری یہ معاملہ بھی ہے کہ وقف جائیدادیں مسلمانوں کی مذہبی دھروہر ہیں اور اگر ان جائیدادوں میں نماز پڑھنے پر کسی کو بیجا اعتراض ہوتا ہے یا ان پر کسی نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے تو انتظامیہ مداخلت کر کے ان اعتراضات کو کیفر کردار تک پہنچائے اور ناجائز قبضوں والے اوقاف کو خالی کروائے۔ پالم وہار کے چوموگاؤں میں صوبائی حکومت نے وقف بورڈ کی دو ایکڑ زمین اپنی تحویل میں لے لی ہے، اس پر ہائی کورٹ نے حکم کیا ہے کہ سرکار متبادل زمین وقف بورڈ کو دے، اس حکم پر کارروائی ہونا باقی ہے۔ ساتھ ہی وزیرآباد، دولت پور، نصیرآباد، دھنکوٹ، میوکا اور گھڑی ہنساور کی مساجد میں نماز اس لیے نہیں ہوتی ہے، کیونکہ زعفرانی عناصر کو اس پر اعتراض ہے۔ اس کے علاوہ جھرسا، فاضل پور، نورنگ پور اور میوکا میں اسی طرح کے عناصر وقف زمینوں پر مساجد کی تعمیر میں بھی رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ میرے خط کے جواب میں مرکزی وقف کونسل نے مجھے لکھا ہے کہ اس نے حکومت ہریانہ کے محکمہ امور داخلہ و عدلیہ کے ایڈیشنل چیف سکریٹری کو خط لکھ کر کہا ہے کہ صوبہ میں مندرجہ بالا وقف املاک پر سے ناجائز قبضے ہٹا کر انھیں وقف بورڈ کی تحویل میں دیا جائے، امید ہے کہ ہریانہ بورڈ اس کارروائی پر نظر رکھ رہا ہوگا۔

دراصل مختلف مذہبی فرقوں کے دلوں میں اس طرح کی ناچاقیاں گزشتہ 70 برس سے ہی رہی ہیں لیکن ان کو حکومت کی طرف سے ہوا نہیں دی جاتی تھی اور عوام میں حکومت کے اس مثبت رویے کی وجہ سے حالات خراب نہیں ہوتے تھے، لیکن حال کے برسوں میں تو ملک کا ماحول بدل ہی گیا ہے جہاں غیر سماجی عناصر کے ذریعہ مذہبی رواداری کو بالائے طاق رکھنے کے لیے آزادی مل گئی ہے، بلکہ مذہبی قطبیت کو فروغ دے کر الیکشن جیتنے کا ہتھکنڈا بنایا جارہا ہے۔ اس کی کوئی فکر ہی نہیں ہے کہ اس طور پر طویل مدت کے لیے سماج کا تانہ بانہ بگڑ جائے گا جس کے دیرپا نتائج ملکی استحکام کے لیے خطرناک ہوں گے۔ جسٹس سچر کمیٹی نے ان اوقاف کی فہرست دی ہے جو دراصل مسجد یا خانقاہ ہونے کے باوجود مرکزی محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہیں، وہاں نماز کی اجازت نہیں ہے جبکہ یہ روک لگانا قانون کے خلاف ہے۔ اس محکمہ کی تحویل میں قدیم جائیدادیں اس وجہ سے دی جاتی ہیں کہ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو اور وہ قائم ودائم رکھی جائیں، لیکن محکمہ کی اندیکھی اور لاپروائی اب ملک میں کہاوت بن چکی ہے۔ ابھی حال میں ہی تاج محل کے تئیں لاپروائی برتنے کے لیے بھی سپریم کورٹ کو حکومت کی سرزنش کرنی پڑی۔ سب جانتے ہیں کہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل والی مساجد و خانقاہوں میں خوب خوب ناجائز قبضے ہیں اور ان کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ نمونے کے طور پر نئی دہلی میں لودی روڈ پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر سے متصل لودی گارڈن میں جا کر ذرا مسجد کا جائزہ لیجیے، نوجوان جوڑے وہاں رومانس کرتے ہوئے کھلے عام نظر آتے ہیں۔

جسٹس سچر رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ آثار قدیمہ کے قانون اور وقف کے قانون کے نفاذ میں اکثر باہمی حدفی تضاد نظر آتا ہے، لہٰذا بڑی تعداد میں محکمہ آثار قدیمہ (اے ایس آئی) کی زیر تحویل وقف جائیدادوں کی ناگفتہ بہ حالت کے مدنظر ضروری ہے کہ اس محکمہ اور مرکزی وقف کونسل کے افسران کی مشترکہ میٹنگ ہر تین ماہ پر ہوا کرے، جس کی روداد وزارتوں کی ویب سائٹ پر پوسٹ کی جائیں۔ ان میٹنگوں میں محکمہ آثار قدیمہ کے زیر تحویل وقف جائیدادوں کی موجودہ حالت پر مباحثہ ہونا چاہیے اور اس کی روشنی میں فیصلہ کر کے وقتاً فوقتاً ان وقف جائیدادوں کو جنھیں سنبھالنے کے لیے محکمہ کے پاس وسائل کی کمی ہے، محکمے کی تحویل سے آزاد کر کے وقف بورڈوں کی سپردگی میں واپس کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں مرکزی وقف کونسل نے مجھے اس مشترکہ میٹنگ کی روداد کی نقل بھیجی ہے جو 17 نومبر 2017 کو مرکزی وقف کونسل و محکمہ آثار قدیمہ کے افسران کے مابین منعقد ہوئی تھی۔ یہ میٹنگ اے ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کی سربراہی میں ہوئی اور اس میں محکمہ آثار قدیمہ کے ملک بھر کے 14 عدد سینئر افسر موجود تھے جبکہ مرکزی وقف کونسل کی نمائندگی صرف نائب لاء افسر نے کی۔ میٹنگ میں محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل کے تحت کسی بھی وقف جائیداد کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ قارئین اور خصوصاً مرکزی وقف کونسل کے اراکین خود غور کر لیں کہ اوقاف کے حالات کیوں خراب ہیں۔

ساتھ ہی سچر کمیٹی نے یہ بھی لکھا کہ مرکزی وقف کونسل کے سکریٹری کا عہدہ حکومت ہند کے کم از کم جوائنٹ سکریٹری کی سطح کا ہونا چاہیے، تاکہ مرکزی و صوبائی حکومتوں اور ضلع سطح کے سرکاری افسران کے ساتھ مرکزی وقف کونسل کا روزمرہ کا رکھ رکھاؤ، خط و کتابت، بول چال اور باہمی لحاظ مراتب و مروت کی سطح میں خاطرخواہ اضافہ ہو جائے۔ ورنہ موجودہ صورت حال کے مطابق کونسل کے سکریٹری کو ملک کی افسرشاہی کی طرف سے جو اہمیت دی جانی چاہیے، وہ انھیں نہیں ملتی ہے اور اس عدم توازن کا اوقاف کے مفادات پر منفی اثر پڑتا ہے۔ دوسری طرف نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یوپی اسمبلی کے ذریعہ پاس شدہ قانون کے مطابق چار عدد اہم صوبائی محکموں کے پرنسپل سکریٹری، وارانسی کے ڈویژنل کمشنر اور ضلع مجسٹریٹ کی سرکاری ذمہ داری ہے کہ وہ مل کے کاشی وشوناتھ مندر کا انتظام کریں۔ قانون میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی افسر ہندو نہ ہو تو اس کی جگہ اس کا ماتحت افسر مندر کے انتظام میں شامل ہوگا۔ کرناٹک کے قانون کے مطابق وہاں کے ہندو پرتشٹھانوں کی دیکھ بھال کمشنر کے طور پر وہ شخص کرتا ہے جو خود کم از کم ضلع مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہو۔ اسی طرح کے قوانین تمل ناڈو، کیرالہ اور آندھرا پردیش میں بھی نافذ ہیں۔ اِسی طرز پر ضروری ہے کہ مرکزی وقف کونسل کے سکریٹری کے عہدے کی سطح کو بھی فروغ دے کر مرکزی حکومت کے کم از کم جوائنٹ سکریٹری پر لایا جائے، ملک کے 725 ضلع مجسٹریٹوں میں سے ہر ایک کی سطح مرکزی حکومت کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے سے کمتر ہوتی ہے اور تمام صوبائی پرنسپل سکریٹریوں کا عہدہ مرکزی حکومت کے جوائنٹ سکریٹری کے عہدے کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا مرکزی وقف کونسل میں یہ ایک تبدیلی کر دینے سے پورے ملک کی سرکاری نظروں میں اوقاف کی اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ دوسری جانب اقلیتی امور کے وزیر خود مرکزی وقف کونسل کے چیئرمین ہوتے ہیں جبکہ ان کے پاس روز آٹھ گھنٹے اوقاف کا کام کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کونسل کے ممبروں میں سے ہی ایک کو (سچر کمیٹی کے مطابق بہتر ہوگا ریٹائرڈ ہائی کورٹ جج) ورکنگ چیئرمین بنا کر انھیں وزیر مملکت کا درجہ دے دیا جائے، فل ٹائم چیئرمین وزیر خود رہیں، اس طرح ملک میں اوقاف کے نظام کو اسٹریم لائن کیا جا سکے گا۔ میں نے وزیر اقلیتی امور کو یہ بھی لکھا کہ دہلی میں سی جی او کمپلیکس سے متصل 2.33 ایکڑ والے وقف زمین کے دو پلاٹ مرکزی وزارت برائے شہری ترقی کے تحت لینڈ اینڈ ڈیولپمنٹ افسر نے وزارت داخلہ کو سی آر پی ایف کے لیے دفتر، بیرک، کینٹین و پارکنگ تعمیر کرنے کے لیے الاٹ کر دیے ہیں، اس وقف زمین پر سے سرکاری ناجائز قبضہ ہٹا کر اسے وقف بورڈ کی تحویل میں دیا جانا چاہیے۔ ان تین ایشوز پر وزارت کا جواب آنا باقی ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 02 Aug-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

شعلہ نمرود ہے روشن زمانہ میں تو کیا

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”جب تم اپنے اندر ایمان خلیل پیدا کرلو تو پھر تم اسی راستے پر خاموشی سے گامزن رہو، اس کا اجر دونوں دنیاؤں میں تمھیں ضرور ملے گا۔ دنیا کی شان وشوکت عارضی ہے، روزمرہ خبریں آتی رہتی ہیں دنیا سے لوگوں کے اچانک چلے جانے کی، تو ہمیں اپنی آخری پیشی کے لیے تیاری میں لگ جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ چنندہ لوگوں کو حق کی تلقین کرنے کا کام بھی کرتے رہنا ہوگا اور دین میں کسی سے نفرت کرنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔“

سترہویں صدی عیسوی میں ایران کے شہر مشہد میں مشہور دانشور میر رضی دانش ہوتے تھے، وہ شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے، ان کا فارسی کا شعر ہے:

شمع خود را می گدازد درمیان انجمن
نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است

پہلے مصرع کا مفہوم ہے کہ شمع اپنی مرضی سے خود اپنے کو اس لیے جلاتی رہتی ہے، تاکہ وہ اوروں کو کارآمد روشنی مہیا کرسکے۔ یہاں پیغام دیا گیا ہے کہ سماج میں بڑی تعداد میں لوگ بڑے خوش بخت ہوتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنے آرام وآسائش کی قدرے قربانی دے کر دیگر افراد کی زندگی بہتر بنانے میں لگے رہیں اور ان اچھے لوگوں میں بھی کچھ کا خدمت خلق کا جذبہ تو بہت ہی اعلیٰ درجے کا اور بالکل بے لوث ہوتا ہے، وہ زمینی سطح پر دوسروں کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اچھائی کی طرف مائل لوگوں کے اندر سوز و گداز پیدا کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہی معنی ہیں میر رضی دانش کے دوسرے مصرع کے، جیسے آج کل ہمارے کچن میں چولہا جلانے کے لیے گیس کے لائٹر میں ایک چھوٹا سا پتھر چھپا ہوتا ہے جس کا کام ہوتا ہے خوش آیند شرر پیدا کرنا، اسی طرح یہ سماج کے اعلیٰ ترین افراد خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اچھے لوگوں کو مستقل کار خیر کرتے رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ لیکن پروردگار کا پیغام نہ سمجھنے کی وجہ سے ان دونوں طرح کے افراد کا فقدان ہے جس کی طرف ملت کی توجہ دلائے جانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میر دانش کے اس شعر کے مصرع اول کی تضمین پر علامہ اقبال نے ہمیں مکمل نظم پیش کردی، جس کے آخری شعر میں وہ کہتے ہیں:

شعلہ نمرود ہے روشن زمانہ میں تو کیا
شمع خود را می گدازد درمیان انجمن

یعنی اگر نمرود کی طرح کے ظالم افراد اب بھی زمانے میں موجود ہیں تو سماج کے اچھے لوگوں کو اسے اپنے لیے چیلنج کے طور پر قبول کرنا چاہیے اور آگے بڑھ کے بے خوف ہوکر اور اپنی ذاتی سہولتوں ومفادات کی قربانی دیتے ہوئے سچ ضرور بولنا چاہیے اور مظلوموں کو ان کا حق دلوانے کے لیے تگ ودو کرتے رہنا چاہیے۔ اس پس منظر میں اقبالؔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دن کلیم طور یعنی حضرت موسیٰؑ سے ایک سوال پوچھا، حضرت موسیٰؑ کے واقعات کی جھلکیاں قرآن کریم کی سورہ الاعراف، الطور، النازعات، النمل اور القصص میں ملتی ہیں اور سورہ التین میں تو اللہ نے طور پہاڑ اور وادی سینا کی قسم ہی کھائی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے زیادہ طویل ومتواتر کسی بھی شخصیت کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے، ان کا ذکر کرنے سے پہلے قرآن کریم میں اچھائی اور برائی کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے زمانے کے بادشاہ فرعون کی پالیسی تھی عوام میں آپس میں تفرقہ پیدا کرکے انھیں آپس میں لڑوا دینا، تاکہ وہ متحد ہوکر اس کی جابرانہ حکومت کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں۔ مختلف گروہوں کا وقت اور ان کے وسائل اسی میں لگ جاتے تھے کہ وہ اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط ثابت کریں۔ علاوہ ازیں فرعون ان گروہوں میں سے ایک کو مخصوص طریقوں سے کمزور بناکے رکھتا تھا، اس گروہ کے افراد کو پریشان کرنے کی کوئی انتہا نہیں تھی، حتیٰ کہ ان کے مردوں کو قتل کروا دیتا تھا۔

ملک مصر کا ایک حصہ ایشیا میں ہے جس کی جغرافیائی جائے وقوع ایک قدرتی کرشمہ ہے، وہ ایسا جزیرہ نما (Peninsula) ہے جس کے شمال جنوب مشرق مغرب میں بالترتیب بحر روم، بحر احمر، خلیج عقبہ اور نہر سوئز واقع ہیں، اسی جزیرہ پر طور پہاڑ اور وادی سینا ہیں اور وادی سینا کے اندر ہی ایک اور ذیلی وادی ہے، جسے وادی فاران کہا جاتا ہے، اسی میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے قبیلوں کو ٹھہرایا تھا، جہاں آگ جلانے کی کوئی سبیل نہیں تھی، تب انھیں رات کے وقت قریب میں طور پہاڑ پر روشنی دکھائی دی تو وہ وہاں گئے آگ لانے کے لیے، لیکن وہ دراصل نور خداوندی تھا، وہاں اللہ نے ان سے کلام کیا، انھیں توریت دی، جسے حضرت موسیٰؑ وادی سینا و وادی فاران لے کر گئے اور وہاں سے وہ پیغام دنیا میں پھیلا، انہی کے ذریعہ لاتخف کا بھی حکم دیا گیا کہ اللہ کے علاوہ اور کسی سے ڈرنا شرک وکفر کے مترادف ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے احکام خداوندی کی مکمل پاسداری کی اور اپنی ذات پر جبر کرکے سماج کے افراد کے حق میں سچ بات کہی اور انھیں ان کا جائز حق دلوانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لہٰذا اللہ نے ان پر نوازشوں کی بارش کردی اور جس طبقے کو فرعون نے کمزور بناکے رکھا تھا، اسی کے ہاتھوں میں حکمرانی سونپ دی۔ تو اس نظم میں اقبالؔ حضرت موسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ آپ کے طفیل میں وادی سینا چمن بن گئی یعنی دنیا میں اللہ کے پیغام کا بول بالا ہوا لیکن اس کے باوجود اب بھی دنیا میں آتش نمرود کے شعلے دہک رہے ہیں۔ یاد رہے کہ نمرود نے اللہ کے خلاف بغاوت کردی تھی اور وہ اپنے کو خدا مانتا تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کے ہی خلاف بغاوت کا پرچم لہرا دیا۔ انھیں قید کرکے نمرود کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ وہ صرف اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ نمرود نے آگ کا بڑا سا الاؤ جلوایا اور غلیل نما مشین کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کو اس میں ڈلوادیا، اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ تو ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیمؑ کی حفاظت کر۔ اس آگ کی جگہ ایک خوبصورت باغ وجود میں آگیا اور فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے آرام وطعام کا انتظام کرنے لگے۔ بعد میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوئی اور نمرود و اس کے پورے لشکر کی بہت عبرتناک موت ہوئی۔

لہٰذا علامہ اقبال اپنی نظم میں پوچھ رہے ہیں کہ پیغام الٰہی کی ان دیکھی، تعصب، حق تلفی اور ظلم وستم رواں دواں ہیں تو اب جو اچھے لوگ ہیں ان کی آنکھ کا پانی کیوں مرگیا، وہ کس سے خوف زدہ ہیں، وہ آواز کیوں نہیں اٹھاتے، انھیں اپنی دولت سے اتنی محبت کیوں ہے وہ اپنے خداداد وسائل کا استعمال ضرورتمند لوگوں کے لیے کیوں نہیں کرتے، وہ قل العفو کی خلاف ورزی کیوں کیے ہوئے ہیں، ملت کا وہ دیرینہ درد دل کیوں اب نظر نہیں آتا ہے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کی طرف سے علامہ اقبال جواب دے رہے ہیں کہ اگر تم صحیح معنوں میں پروردگار کی سچی بندگی کرتے ہو تو تمھیں چاہیے کہ تم اس کے پیغام کو نہ بھول کر صرف دنیاداری میں ہی نہ پڑے رہو۔ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تمھیں اللہ کے حضور میں اپنے وجود کا احساس ہے تو پھر تمھیں حضرت ابراہیمؑ والا ایمان اپنی روح کے اندر سرایت کرنا ہوگا اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ کے نزدیک تمہاری زندگی کا پیرہن خاکستر ہے یعنی تمہارے وجود کی اہمیت مٹی کے مجسمے سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جب تم اپنے اندر ایمان خلیل پیدا کرلو تو پھر تم اسی راستے پر خاموشی سے گامزن رہو، اس کا اجر دونوں دنیاؤں میں تمھیں ضرور ملے گا۔ دنیا کی شان وشوکت عارضی ہے، روزمرہ خبریں آتی رہتی ہیں دنیا سے لوگوں کے اچانک چلے جانے کی، تو ہمیں اپنی آخری پیشی کے لیے تیاری میں لگ جانا چاہیے۔ پھر آخر میں علامہ کہتے ہیں کہ اگر ہم شمع کی طرح اپنے کو اللہ کی خوشنودی کے لیے نچھاور کرتے رہیں تو پھر شعلہ نمرود روشن ہوا کرے، کاہے کی فکر ہے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ چنندہ لوگوں کو حق کی تلقین کرنے کا کام بھی کرتے رہنا ہوگا اور دین میں کسی سے نفرت کرنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے، ہر حال میں محبت ہی بکھیرنی ہے۔ آج کے ہندوستان کے منظرنامے میں ہمیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی اسی سنت پر چلنا ہوگا یہی سبق اقبالؔ نے اپنی اس نظم میں دیا ہے۔ پھر ہمیں شعلہ نمرود کو ٹھنڈا کرکے اسے سبز باغ میں تبدیل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ □❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 02 Aug-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

شعلہ نمرود ہے روشن زمانہ میں تو کیا

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”جب تم اپنے اندر ایمان خلیل پیدا کرلو تو پھر تم اسی راستے پر خاموشی سے گامزن رہو، اس کا اجر دونوں دنیاؤں میں تمھیں ضرور ملے گا۔ دنیا کی شان وشوکت عارضی ہے، روزمرہ خبریں آتی رہتی ہیں دنیا سے لوگوں کے اچانک چلے جانے کی، تو ہمیں اپنی آخری پیشی کے لیے تیاری میں لگ جانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ چنندہ لوگوں کو حق کی تلقین کرنے کا کام بھی کرتے رہنا ہوگا اور دین میں کسی سے نفرت کرنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔“

سترہویں صدی عیسوی میں ایران کے شہر مشہد میں مشہور دانشور میر رضی دانش ہوتے تھے، وہ شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے، ان کا فارسی کا شعر ہے:

شمع خود را می گدازد درمیان انجمن
نور ما چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است

پہلے مصرع کا مفہوم ہے کہ شمع اپنی مرضی سے خود اپنے کو اس لیے جلاتی رہتی ہے، تاکہ وہ اوروں کو کارآمد روشنی مہیا کرسکے۔ یہاں پیغام دیا گیا ہے کہ سماج میں بڑی تعداد میں لوگ بڑے خوش بخت ہوتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنے آرام وآسائش کی قدرے قربانی دے کر دیگر افراد کی زندگی بہتر بنانے میں لگے رہیں اور ان اچھے لوگوں میں بھی کچھ کا خدمت خلق کا جذبہ تو بہت ہی اعلیٰ درجے کا اور بالکل بے لوث ہوتا ہے، وہ زمینی سطح پر دوسروں کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اچھائی کی طرف مائل لوگوں کے اندر سوز و گداز پیدا کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہی معنی ہیں میر رضی دانش کے دوسرے مصرع کے، جیسے آج کل ہمارے کچن میں چولہا جلانے کے لیے گیس کے لائٹر میں ایک چھوٹا سا پتھر چھپا ہوتا ہے جس کا کام ہوتا ہے خوش آیند شرر پیدا کرنا، اسی طرح یہ سماج کے اعلیٰ ترین افراد خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اچھے لوگوں کو مستقل کار خیر کرتے رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ لیکن پروردگار کا پیغام نہ سمجھنے کی وجہ سے ان دونوں طرح کے افراد کا فقدان ہے جس کی طرف ملت کی توجہ دلائے جانے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میر دانش کے اس شعر کے مصرع اول کی تضمین پر علامہ اقبال نے ہمیں مکمل نظم پیش کر دی، جس کے آخری شعر میں وہ کہتے ہیں:

شعلہ نمرود ہے روشن زمانہ میں تو کیا
شمع خود را می گدازد درمیان انجمن

یعنی اگر نمرود کی طرح کے ظالم افراد اب بھی زمانے میں موجود ہیں تو سماج کے اچھے لوگوں کو اسے اپنے لیے چیلنج کے طور پر قبول کرنا چاہیے اور آگے بڑھ کے بے خوف ہوکر اور اپنی ذاتی سہولتوں ومفادات کی قربانی دیتے ہوئے سچ ضرور بولنا چاہیے اور مظلوموں کو ان کا حق دلوانے کے لیے تگ ودو کرتے رہنا چاہیے۔ اس پس منظر میں اقبال کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک دن کلیم طور یعنی حضرت موسیٰؑ سے ایک سوال پوچھا، حضرت موسیٰؑ کے واقعات کی جھلکیاں قرآن کریم کی سورہ الاعراف، الطور، النازعات، النمل اور القصص میں ملتی ہیں اور سورہ التین میں تو اللہ نے طور پہاڑ اور وادی سینا کی قسم ہی کھائی ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے زیادہ طویل ومتواتر کسی بھی شخصیت کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے، ان کا ذکر کرنے سے پہلے قرآن کریم میں اچھائی اور برائی کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے زمانے کے بادشاہ فرعون کی پالیسی تھی عوام میں آپس میں تفرقہ پیدا کر کے انھیں آپس میں لڑوا دینا، تاکہ وہ متحد ہو کر اس کی جابرانہ حکومت کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں۔ مختلف گروہوں کا وقت اور ان کے وسائل اسی میں لگ جاتے تھے کہ وہ اپنے کو صحیح اور دوسرے کو غلط ثابت کریں۔ علاوہ ازیں فرعون ان گروہوں میں سے ایک کو مخصوص طریقوں سے کمزور بنا کے رکھتا تھا، اس گروہ کے افراد کو پریشان کرنے کی کوئی انتہا نہیں تھی، حتیٰ کہ ان کے مردوں کو قتل کروا دیتا تھا۔

ملک مصر کا ایک حصہ ایشیا میں ہے جس کی جغرافیائی جائے وقوع ایک قدرتی کرشمہ ہے، وہ ایسا جزیرہ نما (Peninsula) ہے جس کے شمال جنوب مشرق مغرب میں بالترتیب بحر روم، بحر احمر، خلیج عقبہ اور نہر سوئز واقع ہیں، اسی جزیرہ پر طور پہاڑ اور وادی سینا ہیں اور وادی سینا کے اندر ہی ایک اور ذیلی وادی ہے، جسے وادی فاران کہا جاتا ہے، اسی میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے قبیلوں کو ٹھہرایا تھا، جہاں آگ جلانے کی کوئی سبیل نہیں تھی، تب انھیں رات کے وقت قریب میں طور پہاڑ پر روشنی دکھائی دی تو وہ وہاں گئے آگ لانے کے لیے، لیکن وہ دراصل نور خداوندی تھا، وہاں اللہ نے ان سے کلام کیا، انھیں توریت دی، جسے حضرت موسیٰؑ وادی سینا و وادی فاران لے کر گئے اور وہاں سے وہ پیغام دنیا میں پھیلا، انھی کے ذریعہ لاتخف کا بھی حکم دیا گیا کہ اللہ کے علاوہ اور کسی سے ڈرنا شرک وکفر کے مترادف ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے احکام خداوندی کی مکمل پاسداری کی اور اپنی ذات پر جبر کر کے سماج کے افراد کے حق میں سچ بات کہی اور انھیں ان کا جائز حق دلوانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لہٰذا اللہ نے ان پر نوازشوں کی بارش کر دی اور جس طبقے کو فرعون نے کمزور بنا کے رکھا تھا، اسی کے ہاتھوں میں حکمرانی سونپ دی۔ تو اس نظم میں اقبال حضرت موسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ آپ کے طفیل میں وادی سینا چمن بن گئی یعنی دنیا میں اللہ کے پیغام کا بول بالا ہوا لیکن اس کے باوجود اب بھی دنیا میں آتش نمرود کے شعلے دہک رہے ہیں۔ یاد رہے کہ نمرود نے اللہ کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور وہ اپنے کو خدا مانتا تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کے ہی خلاف بغاوت کا پرچم لہرا دیا۔ انھیں قید کر کے نمرود کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ صرف اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ نمرود نے آگ کا بڑا سا الاؤ جلوایا اور غلیل نما مشین کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کو اس میں ڈلوا دیا، اللہ نے آگ کو حکم دیا کہ تو ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیمؑ کی حفاظت کر۔ اس آگ کی جگہ ایک خوبصورت باغ وجود میں آ گیا اور فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے آرام وطعام کا انتظام کرنے لگے۔ بعد میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول ہوئی اور نمرود و اس کے پورے لشکر کی بہت عبرتناک موت ہوئی۔

لہٰذا علامہ اقبال اپنی نظم میں پوچھ رہے ہیں کہ پیغام الٰہی کی ان دیکھی، تعصب، حق تلفی اور ظلم وستم رواں دواں ہیں تو اب جو اچھے لوگ ہیں ان کی آنکھ کا پانی کیوں مر گیا، وہ کس سے خوف زدہ ہیں، وہ آواز کیوں نہیں اٹھاتے، انھیں اپنی دولت سے اتنی محبت کیوں ہے وہ اپنے خداداد وسائل کا استعمال ضرورتمند لوگوں کے لیے کیوں نہیں کرتے، وہ قل العفو کی خلاف ورزی کیوں کیے ہوئے ہیں، ملت کا وہ دیرینہ درد دل کیوں اب نظر نہیں آتا ہے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کی طرف سے علامہ اقبال جواب دے رہے ہیں کہ اگر تم صحیح معنوں میں پروردگار کی سچی بندگی کرتے ہو تو تمھیں چاہیے کہ تم اس کے پیغام کو نہ بھول کر صرف دنیاداری میں ہی نہ پڑے رہو۔ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تمھیں اللہ کے حضور میں اپنے وجود کا احساس ہے تو پھر تمھیں حضرت ابراہیمؑ والا ایمان اپنی روح کے اندر سرایت کرنا ہوگا اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ کے نزدیک تمہاری زندگی کا پیرہن خاکستر ہے یعنی تمہارے وجود کی اہمیت مٹی کے مجسمے سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جب تم اپنے اندر ایمان خلیل پیدا کرلو تو پھر تم اسی راستے پر خاموشی سے گامزن رہو، اس کا اجر دونوں دنیاؤں میں تمھیں ضرور ملے گا۔ دنیا کی شان وشوکت عارضی ہے، روزمرہ خبریں آتی رہتی ہیں دنیا سے لوگوں کے اچانک چلے جانے کی، تو ہمیں اپنی آخری پیشی کے لیے تیاری میں لگ جانا چاہیے۔ پھر آخر میں علامہ کہتے ہیں کہ اگر ہم شمع کی طرح اپنے کو اللہ کی خوشنودی کے لیے نچھاور کرتے رہیں تو پھر شعلہ نمرود روشن ہوا کرے، کاہے کی فکر ہے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ چنندہ لوگوں کو حق کی تلقین کرنے کا کام بھی کرتے رہنا ہوگا اور دین میں کسی سے نفرت کرنے کی تو گنجائش ہی نہیں ہے، ہر حال میں محبت ہی بکھیرنی ہے۔ آج کے ہندوستان کے منظرنامے میں ہمیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی اسی سنت پر چلنا ہوگا یہی سبق اقبال نے اپنی اس نظم میں دیا ہے۔ پھر ہمیں شعلہ نمرود کو ٹھنڈا کر کے اسے سبز باغ میں تبدیل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ □❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 09 Aug-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

شہزادہ محمد، سعودی معیشت، نظام حج و عالمی پیمانے

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

"اکتوبر 2017 میں سعودی عرب کے پبلک انویسٹمنٹ فنڈ نے دو کمپنیاں بنانے کا اعلان کیا ہے جو دونوں متبرک شہروں میں ضروری انفرااسٹرکچر قائم کریں گی، تا کہ وہاں اضافی زائرین کو رہائش گاہ وغیرہ مہیا ہو سکے۔ اس پس منظر میں تو اور زیاد ہ ضروری ہے کہ زائرین حج و عمرہ کے لیے عالمی پیمانہ کے پختہ ترین انتظامات کیے جائیں۔"

جدہ میں گزشتہ ہفتہ بحر احمر کے ساحل پر سعودی ہیکتھان (Hackathon) کا انعقاد کیا گیا جس کا مقصد تھا حج کے دوران آفت ناگہانی سے بچنے کی غرض سے احتیاطی کارروائی کے راستے تلاش کرنا۔ دوران حج مکہ معظمہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور رمی جمرات میں کم جگہ میں زیادہ لوگوں کو بہتر طریقے سے منظم کرنے کے لیے نئے تکنیکی متبادل تلاش و ایجاد کرنے کے لیے 36 گھنٹے کا مقابلہ ہوا۔ سعودی عرب، یمن اور اریٹریا کی خواتین کا ایک گروپ لیپ ٹاپ پر نیا ایپ (App) بنانے میں لگا تھا، تاکہ سیٹیلائٹ کے ذریعہ مریض کی نشاندہی کر کے اسے فوری طبی امداد مہیا کی جاسکے اور ایک وقت میں کئی ایمرجنسی کیس ہوں تو ان میں سے بتدریج ترجیح طے کی جاسکے۔ مشرقی ایشیا کے ماہرین کمپیوٹر اس کوشش میں تھے کہ حاجیوں کی کلائی پر بلوٹوتھ بینڈ لگاکے اس کا انتظام کیا جاسکے کہ اگر وہ راستہ بھٹک گئے ہوں تو انھیں ایک مجازی تسمہ (Virtual Leash) کے ذریعہ جلد ان کے گروپ کے پاس واپس پہنچا دیا جائے۔ چار سعودی کارندے یہ ترکیب لگا رہے تھے کہ کوڑے دانوں میں ایسے سینسر کس طرح لگائے جائیں کہ بھر جانے پر وہ خود صفائی کرنے والوں کو الرٹ کردیں، تاکہ انھیں فوراً خالی کردیا جائے۔ سعودی خواتین کا ایک گروپ الگورتھم اور پروگرامنگ کوڈس کے ذریعہ یہ تحقیق کررہا تھا کہ کس طرح عربی نہ جاننے والوں کی ضروریات کا عربی و دیگر مختلف زبانوں میں ترجمہ بغیر انٹرنیٹ کے ہوسکے۔

یہ تمام تقریباً 3,000 پروگرامرز لگاتار وہیں پر رہے اور سوئے بھی، اس طرح کسی بھی ہیکتھان میں حصہ لینے والے لوگوں کا اس تقریب نے گنیز بک کا ریکارڈ توڑ دیا۔

یہ ایک خوش آئند پہل تھی اس پس منظر میں کہ حالانکہ حرمین شریفین کی خدمت سعودی شاہی خاندان کی سیاسی بالادستی کا مضبوط ترین آلہ ہے۔ مکہ معظمہ کے نزدیک ستمبر 2015 کے دوران منیٰ میں 717 حجاج اور اس سے دو ہفتہ قبل حرم شریف میں کرین کے گرنے سے 118 عازمین کا جاں بحق ہوجانا اور ان دونوں حادثات میں 1,257 اشخاص کا زخمی ہوجانا، متعلقہ خاندانوں وان کے بہی خواہوں کے لیے کرب وکوفت اور سعودی عرب و عالمی ملت اسلامیہ کے لیے شرمندگی کا باعث رہا ہے۔ 1975 سے اب تک 14 سانحے ہوئے ہیں، جن میں سرکاری رپورٹوں کے مطابق کل ملا کے 4,476 عقیدت مند اللہ کو پیارے ہوگئے اور اس سے بہت زیادہ بڑی تعداد میں لوگ زخمی ہوگئے۔ یعنی گزشتہ 43 برس میں ہر تیسرے چوتھے سال ایک حادثہ ہوا ہے اور اوسطاً ہر برس اللہ کے 100 سے زائد مہمانوں کی وفات ہوگئی۔ ان اموات کی وجہ رہی ہیں مکہ سے منیٰ وعرفات کی طرف جاتی ہوئی سرنگ میں اور جمرات کے پل پر ٹریفک کنٹرول میں کمی، شیطان کو کنکریاں مارتے وقت بھیڑ کنٹرول کرنے کے لیے قبل از وقت پلاننگ کی قلت وغیرہ۔ فریضہ حج کے تئیں ملت کی تعظیم وتکریم پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، زمین حجاز میں تدفین کی جگہ پالینا بھی یقیناً اللہ کی طرف سے بڑا انعام واکرام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لاکھوں عازمین حج کے ذریعہ سال بہ سال اللہ کے گھر کا طواف، سعی، وقوع عرفات، قیام مزدلفہ اور رمی جمرات وقربانی کرنے کا بے عیب انتظام ہو، جس میں لوگوں کی جانیں بیجا نہ جائیں۔

دنیا کے اکیسویں صدی تک پہنچتے ہوئے یہ پوری طرح طے ہوچکا ہے کہ ہر ملک ہر کام کا ماہر نہیں ہوسکتا ہے۔ اس کی بڑی مثال امریکہ خود ہے، جہاں کا معاشرہ مختلف شعبوں میں عالمی ہنرمندوں کی مدد پر منحصر ہے۔ آج اپنے کام کو بہترین اور بے عیب بنانے کے لیے دنیا میں جہاں بھی اس سے متعلق مہارت موجود ہو، اسے وہاں سے حاصل کرلیا جانا چاہیے۔ سعودی عرب بھی بہت سے شعبوں میں اس حکمت عملی پر چل رہا ہے۔ حرمین شریفین میں اور حجاز کے دیگر علاقوں میں حج سے متعلق انتظامات کرنے کا کام بہتر طریقے پر نبھانے کی ذمہ داری سعودی عرب کے ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کی بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ حرم مکہ کے حدود میں غیر مومن کے داخلے کے لیے قرآنی ممانعت ہے (9.28) لیکن ان حدود کے باہر سعودی عرب میں بیٹھ کر عالمی ماہرین سمت شناسی، کنٹرول، نگرانی، معیار کی جانچ اور وقتاً فوقتاً نصیحت تو کرسکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ حج کے انتظام کے کسی شعبے میں بھی عالمی معیار کے متعلق ذرا بھی سمجھوتہ ہرگز نہ کیا جائے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ حج کے انتظامات کے لیے بین الاقوامی ایکسپرٹس کا ایک مستقل گروپ تشکیل کیا جائے جو اوپر سے لے کر نیچے تک ہر پہلو کو زیر غور رکھتے ہوئے سالانہ ایکشن پلان تیار کرے اور اسی کے مطابق ہر سال کے ہر مہینے و ہر ہفتے میں دی ہوئی تاریخ تک دیا ہوا کام مکمل کردے۔ توسیع حرمین کے لیے بھی عالمی ٹنڈرنگ ہونی چاہیے، قابل ترین و تجربہ کار کمپنیوں کو ٹھیکہ دیا جانا چاہیے جو دیا ہوا کام کرنے کے لیے عالمی سطح پر سند یافتہ ہوں۔ ان کاموں کے دوران بار بار معائنہ کرنے کا ٹھیکہ ایک دیگر قابل ترین تجربہ کار سند یافتہ عالمی گروپ کو دیا جانا چاہیے۔ دنیا میں 56 تو مسلم ممالک ہی ہیں اور اس کے علاوہ قابل ترین تجربہ کار سند یافتہ مسلم نوجوان پورے کرہ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں، صرف انھیں مدعو کرنے کی ضرورت ہے، وہ اس کام کو اپنی سعادت سمجھیں گے۔

شہزادہ محمد کے اصلاحاتی پلان 'وژن 2030'، کے تحت سعودی معیشت کے محور کو تیل سے ہٹا کے سرکاری آمدنی کے دیگر ذرائع کی طرف مائل کرنے کی منشا ہے جس میں نظام حج وعمرہ خصوصاً شامل ہے۔ اس اسکیم کے تحت موجودہ 20 لاکھ کے بجائے اب ہر سال 60 لاکھ افراد کو حج کرنے کی اجازت دی جائے گی اور باقی پورے سال میں 30 لاکھ اضافی افراد کو عمرہ کی اجازت ہوگی۔ اکتوبر 2017 میں سعودی عرب کے پبلک انویسٹمنٹ فنڈ نے دو کمپنیاں بنانے کا اعلان کیا ہے جو دونوں متبرک شہروں میں ضروری انفرااسٹرکچر قائم کریں گی، تاکہ وہاں اضافی زائرین کو رہائش گاہ وغیرہ مہیا ہو سکے۔ اس پس منظر میں تو اور زیادہ ضروری ہے کہ زائرین حج وعمرہ کے لیے عالمی پیمانہ کے پختہ ترین انتظامات کیے جائیں۔

❑❖❑

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 16 Aug-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

عیدالاضحیٰ: تو مسلماں ہے تو تقدیر ہے تدبیر تری

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”زمانہ ابراہیمی میں مویشیوں کی تعداد ہی انسانوں کی دولت و ان کی انفرادی و خاندانی خوشحالی اور اقبال مندی کا پیمانہ ہوتی تھی۔ مشہور عالم مفسر عبد اللہ یوسف علیؒ کے مطابق اپنے پسندیدہ جانور کو قربان کرکے اس کا گوشت ضرورتمندوں، اہل خاندان اور دوست احباب میں تقسیم کرنادور ابراہیمی میں اللہ کے بندوں سے انسا ن کی بے لوث محبت جتانے کا سب سے اہم طریقہ تھا۔“

عیدالاضحیٰ میں ہم مسلمانان ہند کے لیے دونوں طرح کے امتحان ہونے والے ہیں۔وہ امتحان جوحضرت ابراہیمؑ کا ہوا تھا اور وہ بھی جوان کے فرزند کا ہوا تھا۔لہٰذا سمجھداری اسی میں ہے کہ ہم ابھی سے خوب غورو خوض کر کے لائحہ عمل طے کریں تا کہ ہم ان دونوں امتحانوں میں سرخ روئی حاصل کریں۔ اہل وطن نے بات شروع کی تھی گائے کے ذبیحہ کی ممانعت سے لیکن معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے پلان کا صرف تمہیدی بیان(Preamble) تھا۔ اس بہانے پورے ملک میں ایسے فعال دستوں کی تشکیل ہوگئی چوکسی کرنے کے لیے کہ کوئی گئوکشی تونہیں کررہا ہے۔غورکریں کہ گاؤں ومحلوں میں 50-100 بیروزگارنوجوانوں کو یہی روزگارمل گیا ہے کہ کڑی نظر رکھیں کہ کہیں گئوکشی سے متعلق کوئی کام تونہیں ہورہا ہےاوراگر دوردور تک کہیں اس کا شبہ بھی ہوتو اس کوروکیں۔ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں،بدمست ہونے کے لیے شراب بھی،ان میں مخبر بھی ہیں اور ’اچھی کارروائی‘ کے بعدان کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام پرتعینات یہ نوجوان سرکاری ملازم نہیں ہیں لیکن اس معاملے میں فی الحال ہمارا پیارا ہندوستان پڑوسی ملک چین کے طرز عمل پرگامزن ہے جہاں حکومت اور برسر اقتدار جماعت کے درمیان تفریق کے حجاب اتنے باریک ہیں کہ (علامہ سے معذرت کے ساتھ) نمایاں ہیں ’امارت‘ کے تبسم ہائے پنہانی۔اگرکسی شہری کے گھر کےفرج میں رکھے ہوئے گوشت کے بیف ہونے کا شبہ بھی ہوتو وہ قریب ترین چوکسی دستے کے ذریعہ متحرک ہوکرحملہ کرنے کے لیے کافی جواز ہےاور سرکاری مشینری حیران نہیں ہوتی جبکہ سرکاری کمپنیوں میں ای وی ایم بننے کے دوران ان کے اندر چپس ایک مخصوص جماعت کے زیر نگرانی لگ رہے ہوں تو بھی یہ چھان بین کا موضوع نہیں بنتا۔

بہر حال اس خلاف معمول دستور شکنی کے پس منظر میں عید الاضحیٰ آ رہی ہے یعنی مسلمانوں کا دوسرا سب سے بڑا تہوار جب وہ اپنے جدِّ امجد کی خدا پسند قربانی کی یادگار کوتازہ کرنے کے لیے خود کسی جانور کی قربانی کرنے میں روحانی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ٹھیک اسی طرح جیسے رِگ ویدا میں مجوزہ اَشوا میدھا یعنی گھوڑے کی قربانی کے مطابق مہابھارت میں کروکشیتر کی جنگ جیتنے کے بعد یدیشٹھر نے یہ قربانی پیش کی تھی۔تامل معاشرہ میں آج بھی جانور کی قربانی کا رواج ہے،زمانہ سنگم کی مشہورادبی کتاب ترومُروگرُۃ پٹی میں ہندوخدامُروگن یاسُبرامنیا کی عبادت کے لیے جانور کی قربانی کی اہمیت تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔راجستھان میں نوراتری کے دوران برہمن پُجاری کے ذریعہ کُل دیوتا کوبھینس یا بکری کی قربانی پیش کی جاتی ہے۔ کرناٹک میں رینوکا دیوی کوبھی یہی قربانی پیش کی جاتی ہے۔ مہاراشٹرا کے کٹھریا کوتادی ہندوفرقہ میں بچہ پیدا ہونے کے بعد دیوی سپتشرنگی کوبکرے کی قربانی پیش کی جاتی ہے،اس کے بعد ہی بارہویں دن نوزائیدہ بچہ کا نام رکھا جاتا ہے۔آسام،مغربی بنگال اور نیپال کے بھی ہندو مندروں میں بکرے،مرغے یا بھینس کی قربانی ہوتی ہے۔بنگال میں قربانی سے قبل جانور کے کان میں پجاری گایتری منتر بھی پڑھتے ہیں۔نیپال کے گدھی مئی تہوار کے دوران بڑی بھیڑ جمع ہوتی ہے اورکئی لاکھ جانور قربان کیے جاتے ہیں۔اڑیسہ کے بودھ ضلع میں کندھین بُدھی کی پوجا ہوتی ہےاور بکرے کی قربانی کی جاتی ہےاور سمبل پور کے سملیشور مندر میں سملیشوری دیوی کے لیے بکرے کی قربانی ہوتی ہے۔ کیرالہ کے مالابار علاقہ میں تھِیَم دیوتا کومرغے کی قربانی پیش کی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سپریم کورٹ نے جانور کی قربانی پر پابندی لگانے سے انکار کردیا ہے۔اس کے باوجود زبردست منفی پروگرام کے تحت ملک میں ایسی ہوا پھیلائی گئی ہے کہ گویا صرف مسلمان ہی جانورکو ذبح کرتے ہیں اور اس طرح وہ ظالم ہیں اورانھیں اس کام سے روکنا چاہیے۔اس حد تک کہ کسی جانور کے ذبیحہ کے شبہ پربھی 50-100 نوجوانوں کا دستہ آتا ہےاورایک مسلمان کو پکڑ کے سرعام موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے،گزشتہ چار برس میں ہریانہ، گجرات، بہار، راجستھان، اترپردیش، اودھم پور(جموں)، ہماچل پردیش، جھارکھنڈ،آسام،دہلی ومغربی بنگال میں ایسی حرکتیں26 دفعہ ہوچکی ہیں۔ایسی صورت حال میں پھر بقرعید آرہی ہے جبکہ پورے ملک کے مسلمان جانور کی قربانی کواپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

سورہ الصافات(37.102-107) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام وان کے فرزند کے مطابق درج ہے (بمطابق تفسیرمولانا عبدالماجد دریابادیؒ) کہ جب وہ لڑکا ان کے ساتھ دوڑ بھاگ کر ہاتھ بٹانے کے قابل ہوگیا تب حضرت ابراہیم کواسے اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی بشارت ہوئی،یعنی وہ شئے قربان کرنے کی جوان کے لیے سب سے زیادہ کارآمد تھی اورانھیں سب سے زیادہ عزیز بھی تھی۔پھرجب وہ باپ بیٹے اس امتحان میں پاس ہوگئے تواللہ نے اپنی رحمت کاملہ سے بیٹے کی جگہ دنبے کولٹادیا۔یہاں ہمیں جواصل سبق مل رہا ہے وہ ہے اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ اوراپنے لیے سب سے زیادہ کام آنے والی چیز کواللہ کی خوشنودی کی خاطر ضرورتمندلوگوں کے لیے پیش کردینا۔ زمانہ ابراہیمی میں مویشیوں کی تعداد ہی انسانوں کی دولت وان کی انفرادی و خاندانی خوشحالی اور اقبال مندی کا پیمانہ ہوتی تھی۔مشہورعالم مفسرعبداللہ یوسف علیؒ کے مطابق اپنے پسندیدہ جانورکوقربان کرکےاس کا گوشت ضرورتمندوں،اہل خاندان اور دوست احباب میں تقسیم کرنادور ابراہیمی میں اللہ کے بندوں سےانسان کی بےلوث محبت جتانے کاسب سےاہم طریقہ تھا۔

آج بھی اگرکچھ لوگ ریگستان کےایک چھوٹے قصبے میں رہائش پذیر ہیں جہاں گوشت خوری زندگی گزارنے کاضروری حصہ ہےتویقیناًوہاں اس کا سیاق وسباق (Context) موجود ہے اوروہاں جانور کی قربانی برمحل ہے۔لیکن دور جدید کے ہرسماج میں کیا قربانی کا گوشت ہی ضرورت مندوں،دوست احباب اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جانا ضروری ہے یا اس رقم سے کسی غریب وبےسہارا یتیم مریض کا علاج کروایا جاسکتا ہے،اس ایشو پر عالم اسلام کے علمائے کرام کے ذریعہ غورکرنے کی ضرورت ہے۔بخاری شریف میں حدیث نبویؐ ہے کہ جو شخص اللہ کی مخلوق پررحم کرتا ہےوہ گویا اپنے پر ہی رحم کررہا ہے۔لیکن بہر حال ہمارے ملک عزیز میں تو قربانی صدیوں سے ہوتی آ رہی ہے اور یہ معاملہ ابھی تک ہندوستانی علمائے کرام کے مابین زیربحث بھی نہیں ہے،ساتھ ہی ہمیں قربانی سے متعلق ہندوستان میں موجودہ مسلم مخالف شرپسندی کے ماحول کوبھی ذہن میں رکھنا ہے۔لہٰذا متعددسماجی تنظیموں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعہ قربانی کا انتظام امسال الحمدللہ ان صوبوں میں جہاں یہ مسلم مخالف ہوا نہیں چل رہی ہے کردیا ہے۔اس کے پیسے ہمارے ملک کے اندر ہی جمع کیے جاسکتے ہیں اور قربانی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے متعلق باقی ذمہ داری ان تنظیموں کی ہے جبکہ اس پوری کارروائی کے دوران ہمارے ملک میں شرپسند عناصرکومسلم کش حرکتیں کرنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔اسی لیے علامہ اقبال سکھا گئے ہیں:

تو مسلماں ہے تو تقدیر ہے تدبیر تری

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالامضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آراان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دارنہیں ہے۔

Published in 30 Aug-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

بھلا میری مجال کہ میں سوال کروں

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

سابق نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کی تقاریر کا مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے بعنوان 'بھلا میری مجال ہے کہ میں سوال اٹھاؤں' (Dare I Question) اور انھوں نے اس کا دلیرانہ ایجابی جواب بھی دیا کہ ضروری ہے کہ ملک کا ہر شہری اپنے واجب شکوک وشبہات کا بھرپور تعمیری اظہار کرے۔ انھوں نے وہ سوال اٹھائے ہیں جو منصفانہ و انسان دوست معاشرہ کے قیام' اس کی بقا اور اس کے راستہ میں حائل رکاوٹوں سے متعلق ہر شہری کے ذہن میں آنے چاہئیں' ایسا کرنا اشد ضروری ہے اگر ہمیں دستوری نظام کی پاسداری کرنی ہے اور عالمی سطح پر ملک کا اعلیٰ مقام بنانا ہے۔ تشویش ظاہر کی گئی ہے کہ فی الوقت ملک میں دو طرح کے چیلنجز ہیں' عوامی زندگی کے اصول و اقدار اور ہمارے جمہوری ادارے۔ دونوں کا ذکر دستور ہند کی تمہید میں ہے اور اس کے متن میں بھی' آج کے ہندوستان میں دونوں ہی کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ موجودہ ملکی مسائل کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے دستور کے بنیادی فرائض کے باب کا مطالعہ کرنے اور اس کی روشنی میں یہ اندازہ لگانے سے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ان پر عمل کس حد تک ہو رہا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ ان میں سے تین یعنی باہمی ہم آہنگی کی تائید وتقویت' سانجھی وراثت کی حفاظت اور سائنسی مزاج کی نشوونما کی اندیکھی زیادہ کثرت وسفاکی سے ہو رہی ہے جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان تصورات کے معنی ومقاصد پر بھی کچھ لوگوں کو شبہ ہے۔ سرکاری بشریاتی سروے (Anthropological Survey of India) کے مطابق ملک میں 4,635 طبقے ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے ثقافتی طور پر مختلف ہیں۔ مشہور مؤرخ کے این پانیکر لکھتے ہیں کہ اس طرح کے مختلف النوع امتیازی اوصاف کے حامل سماجوں کے یکجا ہونے سے ہی ہندوستان نامی ملک وجود میں آیا ہے۔ قومی شناخت کی تشکیل کوئی واقعہ نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک تحریک مسلسل ہوتی ہے' کسی بھی سماج کا وجود ذات یا مذہب کے کسی واحد ثقافتی فرقہ کا مرہون منت نہیں رہ سکتا ہے' نہ کہ متفرقات سے بھرپور ہندوستانی سماج۔ ان شناختوں سے الحاق اور ان سے مخصوص لگاؤ کے ساتھ منسلک ہونا بالکل فطری ہے' یہ مقامی 'حب الوطنی' (Patriotism) ہے بالمقابل 'وطن پرستی' (Nationalism) جو اپنے ملک سے لگاؤ ہے۔ مشہور انگریزی مصنف جارج آرویل کا کہنا ہے کہ حب الوطنی کا تصور ثقافتی وفوجی انداز میں مدافعانہ ہے' جبکہ وطن پرستی کو حکومت پر قابض ہونے کی تمنا سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے وطن کی صنم پرستی کی مخالفت کی تھی اس کے بعد ہی مہاتما گاندھی نے اگست 1925 کی تقریر میں سوال اٹھایا تھا کہ 'کیا وطن پرستی کیلئے نفرت ضروری ہے'۔ اسی لئے جواہر لعل نہرو نے بجائے یکساں ہندوستانیت کے ثقافتی و مذہبی تنوع کی حفاظت کا ماڈل بھایا۔ اسی ادراک کی ترسیل قانون ساز اسمبلی میں کی گئی تھی' یہ وہ شریف النفس قومیت تھی جس میں سیاسی آزادی' اقتصادی عدل اور سماجی اتحاد شامل تھے۔ اس طور پر سماجی جمع بندی ہماری بہترین قومی اقدار میں ضم ہو گئی جو دوسرے کو گوارہ یا برداشت کرنے تک محدود نہیں تھی بلکہ آگے بڑھ کے دوسرے کو خوش آمدید کہنے کے مترادف تھی۔

اسی فیض رساں طرز قومیت کو اب چیلنج کیا جا رہا ہے' اس کی جگہ ثقافتی قوم پرستی (Cultural Nationalism) کے ذریعہ عدم آمیزیت (Exclusivism) کا متبادل نقطہ نظر اپنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ ہندوستان' ہندو نسل' ہندو ثقافت اور ہندو زبان (سنسکرت و اس کی شاخیں) مل کر ہی وطن کا تصور پورا کر دیتے ہیں اور ان اجزائے ترکیبی سے الگ سبھی لوگ اس تصور وطن سے خارج ہیں۔ آر ایس ایس کے سرسنگھ چالک آنجہانی مادھو سداشو گولوالکر نے 1939 میں ناگپور سے شائع اپنی متنازع کتاب 'ہم یا ہماری قومیت متعارف' (We or Our Nationhood Defined) میں لکھا ہے کہ 'ہندوستان میں جو غیر ملکی نسلیں ہیں انھیں ہندو ثقافت و زبان اپنا لینی ہوگی' انھیں اپنا الگ وجود ختم کر کے ہندو نسل میں ضم ہونا پڑے گا ورنہ انھیں ملک میں رہنے کے لئے ہندو قوم کے ماتحت رہنا ہوگا' انھیں کوئی بھی مراعات نہیں ملیں گی بلکہ شہریت کے حقوق بھی نہیں'۔ بی جے پی نے اپنے 1998 کے منشور میں لکھا تھا کہ ہندوتو کا مغز ثقافتی قوم پرستی ہے۔ اب مشہور صحافی شیکھر گپتا نے دسمبر 2017 کے اپنے مضمون میں لکھا کہ 'وزیر اعظم نریندر مودی ہندوستانی قومیت کو ہندو قومیت کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں' اسی اکثریتی قوم پرستی نے انھیں اتر پردیش کا الیکشن جتایا'۔ یاد کرنے کی ضرورت ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر میں تنگ نظر معاندانہ قوم پرستی نے یوگوسلاویہ کے ٹکڑے کر دئے اور اسی طرح کے افسوسناک حالات روانڈا میں اور بعد میں میانمار میں پیدا ہو گئے۔

”قومی اقدار کا نفاذ اداروں کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ ہمارے دستور کا ضمیر ہیں بنیادی حقوق اور رہنمایانہ اصول۔ مہذب سماج کا فرض ہے کہ وہ عوام کو اس مظہر سے آگاہ رکھے اور اس کے علاج کی چارہ جوئی کرتا رہے۔ اپنی جمہوریت کی بنیادی اقدار اور اداروں کی حفاظت ہم سب کی بنیادی ذمہ داری ہے۔“

مردم شماری 2011 کے مطابق ہندوستان میں قومی سطح پر 19.4 فیصد اقلیتی آبادی ہے۔ یعنی اگر مندرجہ بالا ماڈل اپنایا جائے تو ہر پانچویں شخص کی شہریت کے حقوق پر سوالیہ نشان آ سکتا ہے۔ اسی طرح کی امکانی صورت کے ازالہ کے لئے دستور ہند میں جمعیت وسیکولرزم کا راستہ اپنایا گیا تھا۔ سپریم کورٹ نے ایس آر بومئی کے 1994 کے فیصلہ میں کہا تھا کہ ملک کی شہریت طے ہوتی ہے پیدائش سے یا لمبی رہائش سے نہ کہ مذہب' ذات یا زبان کی بنیاد پر۔ ہر شہری کا حق ہے کہ وہ اپنے مذہب کی پابندی کرے بشرطیکہ عوامی زندگی' اخلاقیات یا صحت پر اس کا کوئی منفی اثر نہ ہو۔ حکومت کو اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی مذہب کی سرپرستی کرے' اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مذہبی طور پر غیر جانبدار رہے۔ اگر مذہب کو بیجا بڑھاوا دیا جائے گا تو سماجی عدم اتحاد میں اضافہ ہوگا جس سے قومی انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔ آرٹیکل 15 مذہبی ولسانی اقلیتوں کو تعصب کے خلاف تحفظ دیتا ہے اور انھیں بااختیار بناتا ہے' یہ حقیقت برقرار ہے چاہے یہ کچھ لوگوں کو برہم کیوں نہ کر دے۔ لہٰذا عدم رواداری کے ممکنہ منفی نتائج کے بارے میں عوام کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ سیاسی جمہوریت کا قیام بے معنی ہے اگر اس کی بنیاد میں سماجی جمہوریت نہ ہو' اس میں آزادی' مساوات اور بھائی چارہ ہونا چاہئے' یہ تینوں ایک دوسرے کے لئے جزو لازم ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اگر مذہب کی بنیاد پر تفریق کی جائے گی تو سماج میں بھائی چارہ کا قیام ممکن نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہر شہری کا حق ہے کہ سوال کر سکے اور جائزہ بھی لے سکے' مہذب سماج میں اختلاف ناگزیر ہے۔ قومی اقدار کا نفاذ اداروں کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ ہمارے دستور کا ضمیر ہیں بنیادی حقوق اور رہنمایانہ اصول۔ مشہور وکیل فالی نریمن نے مئی 2011 کے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ ملکی انتظامیہ میں سیاسی اور پروفیشنل کرداروں کا توازن بگڑ رہا ہے' حکومت کی اقبال مندی میں بتدریج کمی آ رہی ہے کیونکہ انتظامیہ اپنے فرائض معقولیت سے انجام نہیں دے رہی ہے۔ عدلیہ میں بھی جوابدہی کا میکانزم کمزور ہے۔ سرکاریہ کمیشن کا کہنا ہے کہ ضابطہ اخلاق میں شگاف پڑ رہے ہیں' مصلحت عقل پر حائل ہے' ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر سبقت حاصل ہے' تشدد اور غیر دستوری طریقوں کا بول بالا ہے۔ حامد انصاری لکھتے ہیں کہ انتخابی جمہوریت قائم ہے لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا یہ جمعی' مساوی' سیکولر اور مشترک ہے یا یہ تنگ نظر اور نسل پرست ہے۔ اقدار و ادارے ایک دوسرے سے باہمی عضوی تعلق رکھتے ہیں' وہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں' ایک کمزور پڑے تو دوسرے پر منفی اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا تصحیح دونوں کی بیک وقت ہونی ہوتی ہے۔ مہذب سماج کا فرض ہے کہ وہ عوام کو اس مظہر سے آگاہ رکھے اور اس کے علاج کی چارہ جوئی کرتا رہے۔ اپنی جمہوریت کی بنیادی اقدار اور اداروں کی حفاظت ہم سب کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 06 Sep-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

مستقبل قریب میں مصنوعی ذہانت کے فائدے وخطرات

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

آج کل ہم میں سے ہر ایک کی جیب میں ایک ایسا فون ہوتا ہے جس کی وجہ سے پورے عالم کا تمام علم ہمیں حاصل ہو جاتا ہے، موسم کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے، خرید و فروخت بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی کاریں ایجاد ہو چکی ہیں جن میں ڈرائیور بیٹھ کے کتاب پڑھتے رہیں اور کار بے خطر چلتی رہے۔ گوگل کمپنی کے ڈائرکٹر انجینئرنگ رے کورزویل (Ray Kurzweil) نے پیش گوئی کی ہے کہ آنے والے 30 برس میں یعنی 2050 سے قبل جو ایجادیں ہونے والی ہیں وہ انسانی زندگی کو تہ و بالا کر دیں گی۔ خود سے چلنے والی کاروں اور دیگر گاڑیوں کا کاروبار 2035 تک 8 لاکھ کروڑ کا ہو جائے گا، مائیکرو پروسیسر (Microprocessor) نے حال میں انٹیل (Intel) کو جوائن کیا ہے۔ انھوں نے اسے مسافرانہ معیشت (Passenger economy) کا نام دیا ہے جس میں سامان کا لانا لے جانا شامل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ معیشت 2050 تک بڑھ کے 70 کھرب ڈالر کی ہو جائے گی۔ خود چلنے والی گاڑیوں اور سامان کو ڈرون (Drone) سے بھیجے جانے کی وجہ سے 2035-2045 کے دس سالہ وقفہ کے دوران 5 لاکھ سے زیادہ موتیں روک لی جائیں گی۔ آئی ایچ ایس آٹوموٹو (HIS Automotive) کی تحقیق کے مطابق 2050 تک دنیا میں ہر کار خود چل رہی ہوگی۔ جنرل موٹرس کمپنی نے اعلان کیا ہے کہ 2019 میں وہ نئی کار بازار میں لا رہے ہیں جس میں صرف اسٹیرنگ وہیل اور پیڈل ہوں گے اور کوئی گیئر وغیرہ نہیں ہوں گے، ان کی نقل و حرکت پائیتھاگورس والی اعدادی ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ہوگی۔ اگلے دس برسوں میں ہی اسمارٹ فون کا دور قدیم و پارینہ ہو چکا ہوگا، اس کی جگہ انسان کی کلائی پر ہی اسکرین کھل جائے گا اسی پر بٹن دبا کے فون اور کمپیوٹر کے سبھی فائدے اٹھائے جاسکیں گے۔

کمپیوٹر پر چلنے والی کافی مشینیں دماغ کا حصہ بن چکی ہوگی۔ مشہور عالم کمپنی ٹیسلا (Tesla) کے بانی انجینئر ایلان مسک (Elon Musk) نے نیورالیک نام کی ٹیکنالوجی کا نیا پروجیکٹ شروع کیا ہے جس کے ذریعہ انسانی دماغ اور مشین کے درمیان کی دوری ختم ہو جائے گی۔ ان ہی کی کمپنی اسپیس ایکس (SpaceX) پہلے ہی ایک راکٹ ایجاد کرچکی ہے جسے خلا میں بھیجنے کا خرچ اب تک کے مقابلہ میں ایک تہائی رہ گیا ہے، اب وہ کوشش کر رہی ہے کہ ایک ہی راکٹ کو اگلے 24 گھنٹہ کے اندر دوبارہ استعمال کیا جاسکے۔ ان کے ساتھ امریکہ کی قومی ایجنسی برائے خلائی انتظام کے خلاباز ڈان ٹامس کا بھی کہنا ہے کہ اگلے دس برس میں خلائی سیاحت (Space Tourism) کا دور شروع ہو جائے گا۔ مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) کے حالیہ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ انسانیت کے لئے یہ سب سے خطرناک شئے ثابت ہوسکتی ہے، ایک ترکیب نکلی ہے جس کے ذریعہ دو انسان جو گفتگو کریں گے وہ صرف وہی دونوں سمجھ سکتے ہیں، یہی کہنا ہے مصنوعی ذہانت کے مشہور آنجہانی سائنٹسٹ اسٹیفن ہاکنس کا۔ 2029 تک جب آپ فون پر کسی انجان شخص سے بات کریں گے تو آپ کو لگ سکتا ہے کہ آپ اپنے کسی قریب ترین انسان سے محو گفتگو ہیں۔ وہی انداز وہی ہنسی لیکن در اصل دوسری طرف سے آپ سے ایک مشین بات کر رہی ہوگی، اس امکانی صورت کے خطرات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے، اسی لئے مع ہاکنس کے بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ اس ٹیکنالوجی پر پابندیاں لگائی جانی چاہئیں۔ جنسی تسکین کے لئے انسان کی شکل کے مصنوعی روبوٹ مارکیٹ میں آچکے ہیں، یہ سلسلہ بڑھتا ہی جائے گا اور لوگ جذباتی رومانس کے تعلق کے بجائے مصنوعی تسکین پر اکتفا کرنے لگیں گے جس سے سماجی نشو و نما پر منفی اثرات پڑیں گے۔ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈیوڈ لیوی نے اس عنوان پر کتاب شائع کی ہے ان کا کہنا ہے کہ 2050 تک انسان کی روبوٹ سے شادی جائز قرار دے دی جائے گی۔

آج دنیا میں کینسر ایک موذی بیماری بنی ہوئی ہے، لیکن سائنسی ترقی کی وجہ سے 1990 کے بعد سے دنیا میں کینسر سے اموات کی شرح میں ایک فیصد کی تخفیف ہوئی ہے، اب جو تحقیقات رواں ہیں ان کی وجہ سے امید ہے کہ 2050 تک کینسر سے پریشان 80 برس سے کم کے مریضوں کی کینسر سے موت کی شرح صفر ہو جائے گی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ انسان کے جسم میں خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، لیکن مستقل تحقیقی جدوجہد کی وجہ سے ان خرابیوں کی جلد تشخیص، علاج کے ماڈرن ترین ذرائع اور نئی دواؤں کی مدد سے، جن میں کمپیوٹرائزڈ سہ فلکی امپلانٹ، علم توالد و تناسل، اسٹم سیل ٹیکنالوجی اور کرسپر (Clustered Regularly Interspaced Short Palindromic Repeats:CRISPR) شامل ہیں، عمر درازی کو اب نامعلوم پر اسرار ناگزیر فعل تسلیم نہیں کیا جاتا ہے، اس علم کے مشہور سائنٹسٹوں کا کہنا ہے کہ 2020 کے بعد سے صحیح معالجانہ پروٹوکول کے استعمال سے زیادہ عمر ہو جانے کے باوجود بھی بقیہ زندگی آسانی اور مضبوطی سے رواں دواں رکھی جا سکے گی۔ انسانی توارثی نطفہ (Genes) پر مع چین کے متعدد ممالک میں تحقیق چل رہی ہے، گلوبل برینس (Global Brains) کے مطابق 2050 کے بعد عام طور پر انسان اپنی 120 ویں سالگرہ ذوق و شوق سے منا سکیں گے۔ ٹرانس ہیومنزم (Trans-humanism) ایک حالیہ تصور ہے، جن افراد کو اللہ ہاتھ یا پیر سے محروم کر دیتا ہے وہ اسپتال جا کر مصنوعی ہاتھ پیر لگوا لیتے ہیں اور ان کی زندگی کافی حد تک معمول پر آجاتی ہے، بنیادی طور پر اسی ٹیکنالوجی کو ٹرانس ہیومنزم کہتے ہیں۔ جو لوگ ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں ان کے لئے بہت چھوٹی سی کمپیوٹر کی چپ تیار ہوگئی ہے جسے ان کے سر پر ائیر فون کی طرح آسانی سے لگا دیا جاتا ہے اور اس طرح ان کو کافی حد تک افاقہ ہوجاتا ہے۔

اسی طرح جسم کے متعدد دیگر اعضا کو اس ٹیکنالوجی کے ذریعہ دوبارہ استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح امید ہے کہ 2050 تک مصنوعی دماغ بھی تیار ہو جائے گا۔ امریکہ کے صوبہ میساچوسٹس کی کمپنی نارالوجکس (Nara-Logics) نے انسانی دماغ کی طرز پر مصنوعی ذہانت کا ایک پلیٹ فارم تیار کیا ہے، اگلے دس برس میں یہ ممکن ہوگا کہ کسی انسان کے دماغ میں جو بھی شعور و آگہی ہے وہ سب اس پلیٹ فارم پر منتقل کی جاسکے گی اور وہاں سے اسے انسانی دماغ کے سائز کے مصنوعی دماغ میں ڈالا جا سکے گا۔ اس طور پر مصنوعی جسمانی اعضا و مصنوعی دماغ کو جوڑ کے خدا معلوم دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ گزشتہ 30 برس سے رے کورزویل ٹیکنالوجی کے مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں کرتے آرہے ہیں اور یہ 86 فیصد تک صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت جلد ہم تکنیکی یکتائی (Technological Singularity) کے دور میں داخل ہو جائیں گے جس کا مطلب ہے کہ تکنیکی ذہانت کو انسانی ذہانت میں ضم کرنے سے انسانی ذہانت میں لاکھوں گنا اضافہ ہو جائے گا۔ آج بھی کسی بحث کے دوران کوئی نکتہ یاد کرنا ہو تو فوراً فون میں انٹرنیٹ کے ذریعہ وہ پڑھا جا سکتا ہے، ٹیکسی منگانے کے لئے صرف فون پر ہی کمانڈ دینے سے ٹیکسی کا نمبر، ڈرائیور کا نام اس کا فون نمبر اور وہ کہاں تک پہنچا سب معلوم ہو جاتا ہے، تکنیکی یکتائی کا یہ سلسلہ 2050 تک پختگی تک پہنچ جائے گا۔ ضروری ہے کہ ہم ان امکانات سے آگاہ رہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں اور منفی رجحانات سے احتیاط کریں۔

□❖□

’آج بھی کسی بحث کے دوران کوئی نکتہ یاد کرنا ہو تو فوراً فون میں انٹرنیٹ کے ذریعہ وہ پڑھا جا سکتا ہے، ٹیکسی منگانے کے لئے صرف فون پر ہی کمانڈ دینے سے ٹیکسی کا نمبر، ڈرائیور کا نام اس کا فون نمبر اور وہ کہاں تک پہنچا سب معلوم ہو جاتا ہے، تکنیکی یکتائی کا یہ سلسلہ 2050 تک پختگی تک پہنچ جائے گا‘

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

Published in 13 Sep-2018 | Print Edition of Roznama Sahara

عدالتی اکثریت نوازی پر دانشورانہ تشویش

نظریہ

ڈاکٹر سید ظفر محمود

”بجز آندھرا پردیش کے ملک بھر کی ریاستی ہائی کورٹوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب کے بالمقابل کم ہے اور جموں و کشمیر اور حیدرآباد کے علاوہ ملک بھر کی ریاستی سطح کی عدالتوں میں مسلم نمائندگی کی شرح گرتی ہی جا رہی ہے۔ غور کریں کہ ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی کتنی ضروری ہے۔“

جیلوں میں مسلمانوں کی موجودگی 21 فیصد ہے لیکن مقدمے کے اختتام پر الزام ثابت ہونے تک یہ فیصد گھٹ کے 15 رہ جاتا ہے، جو قومی آبادی میں مسلم تناسب کے تقریباً برابر ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ بڑی تعداد میں گرفتار شدہ مسلمانوں پر فرد جرم ثابت نہیں ہوتی ہے اور وہ بری کردیے جاتے ہیں، لیکن اس دوران وہ عموماً 10-15 برس جیل میں رہ چکے ہوتے ہیں۔ الزام تراشی اور سزاواری کے درمیان اس نمایاں فرق سے مسلمانوں کے خلاف انتظامیہ کا تعصب ظاہر ہوتا ہے اور ساتھ ہی عدلیہ کی پیشہ ورائیت میں لچک کا احتمال بھی، گوکہ اعلیٰ عدالتی سطح پر یہ لچک کم نظر آتی ہے۔ یہ خیال ہے لندن کے کنگس انڈیا انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر کرسٹوفر جیفر یلاٹ اور اشوکا یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر گلس ورنیرس کا جن کا اس ایشو پر مضمون بعنوان 'بنچ میں غیر موجودگی' (Absence from the Bench) حال میں ہمارے ملک کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ سوشل میڈیا میں شیوا جی اور بال ٹھاکرے کی شان میں گستاخانہ خاکے کی مخالفت میں ہندو راشٹر سینا کی ریلی میں سے نکل کر تقریباً 20 مشتعل افراد نے مسجد سے نماز پڑھ کر لوٹنے والے 24 سالہ نوجوان کمپیوٹر انجینئر محسن شیخ کو پونہ میں قتل کردیا۔ عدالت نے محسن پر حملہ کرنے والے 23 لوگوں پر قتل کے الزام کے مدنظر ان کو حراست میں رکھنے کا حکم دیا۔ بامبے ہائی کورٹ نے انھیں اپنی نگرانی میں مشروط رہائی دے دی، کیونکہ ان کے مشتعل ہونے کی وجہ محسن کا مذہب تھا اور ذاتی دشمنی جیسی کوئی شئے حملے کی وجہ تسمیہ نہیں تھی، اس دلیل کو جج نے ملزمین کے حق میں مانا۔

محسن کے گھر والے سپریم کورٹ گئے، جس نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو الٹ دیا یہ کہتے ہوئے کہ محسن کا تعلق مختلف مذہب سے ہونا ملزمین کے ذریعے اس پر حملہ کرنے اور اسے قتل کردینے کا جواز نہیں مانا جا سکتا ہے۔ عدالت عظمیٰ نے ذیلی عدالتوں کو یہ بھی تنبیہ کی کہ مذہبی تعداد ہمارے ملک کی سماجی تعمیر و ترتیب کا شاہکار ہے اور عدالتوں کی ذمہ داری ہے کہ مختلف مذہبی فرقوں کے حقوق کی پاسداری کریں۔ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کو ضرورت پڑی اس قدر معمولی سے نکتے کو سمجھانے کی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم مخالف تعصب کس حدتک ذہنوں میں سرایت کرچکا ہے۔ دراصل سپریم کورٹ کے ذریعے مسلمانوں کو ہائی کورٹ و دیگر عدالتوں سے حفاظت کرنے کی تاریخ رہی ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے 2010 میں ایودھیا معاملے میں متنازع فیصلہ دیا تھا، اسی نے فروری 2018 میں ان وقف املاک کے استحقاق و مطالبہ کا فیصلہ کردیا، جو فن تعمیر و زوننگ کی رہنمایانہ ہدایات پر پوری نہیں اترتیں، جبکہ یہ دونوں ہی فیصلے ارتسامیت (Subjectivity) پر مبنی تھے۔ سپریم کورٹ نے اس فیصلے پر روک لگا دی، اس سے پہلے کہ موجودہ حکومت اس کا نفاذ کردیتی۔ اقلیتی تعلیمی اداروں کی قومی کونسل نے 2004 میں اپنے قیام کے بعد سے 13,331 تعلیمی اداروں کا اقلیتی کردار تسلیم کیا، 2014 میں نئی حکومت کے آنے کے بعد اس کے چیئرمین جسٹس صدیقی نے استعفیٰ دے دیا تھا، اس کے بعد سے ان کی جگہ تعیناتی نہیں کی گئی ہے۔ دریں اثنا کمیشن کے ایک حکم کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ کے فیصلے کو سپریم کورٹ نے الٹ دیا اور کمیشن کے قیام اور کمیشن کے دستوری جواز پر عدالت عظمیٰ نے مثبت مہر لگا دی۔ عدلیہ میں مسلمانوں کی عدم موجودگی سے ہائی کورٹوں کا یہ اکثریت نواز مزاج شدت پذیر ہوجاتا ہے۔

بجز آندھرا پردیش کے ملک بھر کی ریاستی ہائی کورٹوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب کے بالمقابل کم ہے اور جموں و کشمیر اور حیدرآباد کے علاوہ ملک بھر کی ریاستی سطح کی عدالتوں میں مسلم نمائندگی کی شرح گرتی ہی جارہی ہے۔ مغربی بنگال میں 1991 میں 25 فیصد کے مقابلہ میں ہائی کورٹ میں مسلمان ججوں کا تناسب کم ہوکر 2011 میں 8 فیصد رہ گیا، جبکہ اسی وقفے میں ریاست میں مسلم آبادی کا فیصد 23 سے بڑھ کے 27 ہوگیا تھا۔ کرناٹک ہائی کورٹ میں 1961 میں 16 فیصد جج مسلمان تھے جبکہ 2011 میں یہ شرح گھٹ کے 3 فیصد سے کم رہ گئی۔ اسی دوران جبل پور ہائی کورٹ میں یہ ہندسہ 14 فیصد سے گھٹ کے 3 فیصد رہ گیا، پٹنہ ہائی کورٹ میں 1951 میں ایک چوتھائی جج مسلمان تھے جبکہ 2011 میں ان کی تعداد گھٹ کے 5 فیصد رہ گئی، حالانکہ اسی دوران صوبہ کی مسلم آبادی میں ایک تہائی کا اضافہ ہوا ہے۔ ادھر سپریم کورٹ میں بھی کچھ اسی طرح کی کہانی ہے۔ دستور سازی کے بعد پچاس کی دہائی میں 16 سپریم کورٹ جج مسلمان تھے، 60 کی دہائی میں کوئی بھی نیا مسلمان جج تعینات نہیں ہوا، 70 کی دہائی میں 26 ججوں کا تعین ہوا، اس میں سے صرف دو مسلمان تھے، 80 کی دہائی میں 33 ججوں کا تعین ہوا، اس میں سے چار مسلمان تھے، اس کے بعد سے نئے تعین شدہ ججوں کی کل تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، لیکن ان میں مسلم ججوں کا تناسب گھٹتا رہا۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں 40 میں سے 3، اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں 49 میں سے 2 اور 2010 سے 2018 تک 40 میں سے 3 سپریم کورٹ کے جج مسلمان تھے۔ اس طور پر آزادی کے بعد سے 2017 تک 229 سپریم کورٹ ججوں کی تعیناتی ہوئی، جس میں سے 18 جج مسلمان تھے یعنی 8 فیصد جبکہ مسلم آبادی قومی سطح پر 14.2 فیصد ہے۔ معلوم ہوا کہ پارلیمنٹ، اسمبلیوں، پولیس، فوج، انتظامیہ کے ساتھ عدلیہ میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی اپنے حق کے مقابلے میں کم رہی ہے اور گھٹتی جارہی ہے۔

نومبر 2006 میں جسٹس سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ عدلیہ میں بھی مسلمانوں کی متناسب قلت ملک کے لیے موجب تشویش ہونی چاہیے۔ عدلیہ میں ہندو شیڈولڈ کاسٹ و ہندو شیڈولڈ ٹرائب کا مشترکہ حصہ 23 فیصد ہے، او بی سی کا 20 فیصد اور اس کے علاوہ دیگر ہندوؤں کا حصہ ان کی آبادی کی شرح سے دوگنا ہے، لیکن مسلمانوں کا حصہ صرف 7 فیصد ہے، جو آبادی میں ان کی مناسبت کے مقابلے میں صرف آدھا ہی ہے اور وہ بھی زیادہ تر عدلیہ کی ادنیٰ ترین سطح پر ہے، سیشنس جج و اس سے اوپر دال میں نمک ہی ہے۔ اس وقت کمیٹی کو گزشتہ پانچ برس میں اترپردیش، آسام، گجرات، کرناٹک، اتراکھنڈ، دہلی، راجستھان، اڑیسہ اور ہماچل پردیش کے ریاستی پبلک سروس کمیشنوں کے ذریعہ منتخب سرکاری افسروں کا ڈیٹا حاصل ہوا تھا، جس سے معلوم ہوا تھا کہ نومنتخب افراد میں 88.8 فیصد حصہ تمام طرح کے ہندوؤں کا تھا، 3.2 فیصد مسلمانوں کا اور 8 فیصد دیگر اقلیتوں کا۔ ذیلی اسٹاف میں سبھی طرح کے ہندوؤں کا حصہ 98 فیصد تھا اور گروپ ڈی یعنی چپراسی وغیرہ میں سب طرح کے ہندو 98.9 فیصد تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ انٹرویو کے لیے جو لوگ بلائے گئے تھے، ان میں مسلمانوں کا فیصد کافی زیادہ تھا، بالمقابل منتخب کیے گئے افراد میں۔ دراصل گروپ ڈی میں جو لوگ انٹرویو کے لیے بلائے گئے تھے، ان میں سے 18 فیصد مسلمان تھے لیکن جن لوگوں کا انتخاب ہوا ان میں مسلمان صرف ایک فیصد تھے۔ اب غور کریں کہ ملک کی حکمرانی میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی کتنی ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سب لوگ ووٹر بنیں، سب اپنے نام کا اندراج ووٹر لسٹ میں یقینی بنائیں، سب ووٹ دینے ضرور جائیں اور اپنا ووٹ تقسیم نہ ہونے دیں۔ اللہ نے صاف کہہ دیا ہے کہ تمھیں وہی ملے گا، جس کے لیے تم کوشش کروگے۔ 2019 کے الیکشن میں بہت کم وقفہ رہ گیا ہے، ہمیں اپنے دستوری حق کو یقینی بنانا ہوگا۔

□❖□

نوٹ: مندرجہ بالا مضامین میں مضمون نگاروں کے ذریعہ ظاہر کی گئی آرا ان کی ذاتی ہیں اور ادارہ اس کیلئے کسی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔